

## جاہلیت کی نرسریاں

ہم بڑے عرصے سے یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری جدید تعلیم کی مغربی طرز کی یونیورسٹیاں جاہلیت کی نرسریاں ہیں کچھ ان کا سوچو لیکن کوئی ہماری بات پر کان نہیں دھرتا۔ جہالت کی ان فیکٹریوں نے ایسے ایسے نابغہ روزگار اور جاہل وزیر پیدا کیے ہیں جن کو کسی چڑیا گھر میں بھجوانا چاہیے یا کم از کم ان کے تخلیق کردہ لطیفہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کو بھجوائے جانے چاہئیں مثلاً جب ہم سکول میں پڑھتے تھے تو اُس وقت کے ایک وزیر صاحب ایک ہائیڈرو پاور پراجیکٹ کا معائنہ کرنے گئے اور جو انجینئر ان کو وزٹ کر رہا تھا اسے کہنے لگے کہ جب آپ نے اس پانی میں سے بجلی نکال لی تو یہ پھوکا ہو گیا اب زرعی زمینوں کو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ ایک نابغہ عصر وزیر صاحب نے پارلیمنٹ میں فرمایا کہ قرآن کے چالیس پارے ہوتے ہیں۔ ایک رجب عظیم سورہ اخلاص نہ سنا سکے۔ اب نواز شریف صاحب کہ اکبر ثانی ہیں، ان کی کابینہ کے نورتوں میں سے ایک جناب پرویز رشید صاحب نے گانے، سوانگ بھرنے اور ناچنے والوں سے متعلقین کی ایک مجلس میں ارشاد فرمایا ہے کہ دینی مدرسے جہالت کی فیکٹریاں ہیں اور یہ لوگ لاؤڈ سپیکر پر پانچ وقت لوگوں کے کان کھاتے رہتے ہیں..... ہم اس سے پہلے البرہان میں لکھ چکے ہیں کہ یہ صاحب پرویز ہیں (بلکہ خسرو پرویز ہیں) رشید نہیں ہیں لیکن کوئی ہماری بات پر کان نہیں دھرتا۔

کل ایک مجلس میں لوگ ان صاحب پر تبصرے کر رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ انہیں پاگل خانے بھجوانا چاہیے۔ دوسرے نے کہا: نہیں ٹوڈل کے پاس۔ ایک دل جلے نے کہا: انہوں نے پانچ وقت کی اذانوں کی تحقیر کی ہے لہذا انہیں پانچ سال کے لیے جیل بھجوا دیا جائے۔ ہم نے کہا نہیں ان کی سزا کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انہیں جبراً کسی مدرسے میں پانچ سال کے لیے داخل کر دیا جائے تاکہ انہیں پتہ چل جائے کہ علم کیا ہوتا ہے اور جہالت کیا ہوتی ہے!

## تھوڑی سی ہمت اور

۱۳ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا جب پاکستان دہشت گردی کا شکار ہوا۔ ہم اور بہت سے دوسرے لوگ پہلے دن سے کہہ رہے ہیں کہ یہ امریکہ اور یہودیوں کی پلاننگ اور سازش ہے اور یورپ، بھارت اور افغانستان ان کے آلہ کار ہیں خصوصاً بھارت جس کی پاکستان دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اور وہ برصغیر کی تقسیم کے فیصلے کو ختم کرنا چاہتا ہے لیکن حکومتی حلقے His Master's voice کے ساتھ سُر ملتے ہوئے یہی کہتے رہے کہ دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ ہماری اپنی جنگ ہے۔

اب ۱۳ سال بعد ہماری سیاسی و عسکری قیادت نے یہ ہمت کی ہے اور کھل کر بھارت کو اس دہشت گردی کا ذمہ دار ٹھہرانا شروع کیا ہے۔ ابھی اس ضمن میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے مثلاً بھارت کے خلاف ہمیں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل میں جانا چاہیے، دنیا بھر میں بھارت کے خلاف پروپیگنڈا مہم شروع کرنی چاہیے تاکہ بپے کے مکروہ چہرے کی حقیقت دنیا پر عیاں ہو اور بھارتی مہم جوئی کو کاؤنٹر کرنے کے دوسرے ممکنہ طریقے بھی اختیار کرنے چاہئیں۔

..... لیکن یہ کافی نہیں ہے ہماری عسکری اور سیاسی قیادت کو تھوڑی سی ہمت اور کرنی چاہیے اور اس دہشت گردی کے اصل محرک اور منصوبہ ساز امریکہ کا نام بھی کھل کر لینا چاہیے کہ پاکستان کے خلاف اس ساری دہشت گردی کا اصل ذمہ دار وہ ہے۔ جس طرح بھارت کے خلاف ہمارے پاس ثبوت موجود ہیں اسی طرح کے ثبوت امریکہ کے خلاف بھی موجود ہیں اور اکٹھے کیے جاسکتے ہیں۔ ہم اپنی سیاسی اور عسکری قیادت کو یقین دلاتے ہیں کہ اس معاملے میں پوری قوم ان کی پشت پر ہوگی اور اس کے لیے وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہوگی۔ بات صرف ہمت کی ہے، دشمن آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور ہر مشکل کا ایک نہ ایک حل نکل آتا ہے۔ بات صرف عزم، ارادے اور ہمت کی ہے اور وہ قیادت ہی کیا جس میں یہ خوبیاں نہ ہوں! اگر آپ اللہ پر بھروسہ کر کے یہ ہمت کریں تو آپ کو اللہ ہی کافی ہے لیکن اگر آپ دنیا داری اور تدبیر کے لحاظ سے سوچیں تو چین اور افغان طالبان اس معاملے میں آپ کے دست و بازو بن سکتے ہیں۔

## اسلامی نظام تعلیم سکول سطح پہ تعلیم کا عملی نقشہ

ان اصولی باتوں کی وضاحت کے بعد اب میں تفصیل کے ساتھ یہ بتاؤں گا کہ وہ اسلامی نظام تعلیم جس کو ہم یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کا عملی نقشہ کیا ہے؟

### ابتدائی تعلیم

سب سے پہلے تو ابتدائی تعلیم کو لیجیے جو اس عمارت کی بنیاد ہے۔ اس تعلیم میں وہ سب مضامین پڑھائیے جو آج کے پرائمری اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور دنیا بھر میں ابتدائی تعلیم کے متعلق جتنے تجربات کیے گئے ہیں اور آئندہ کیے جائیں ان سب سے فائدہ اٹھائیے، لیکن چار چیزیں ایسی ہیں جو اس کے ہر مضمون میں پیوست ہونی چاہئیں۔

**اول** یہ کہ بچے کے ذہن میں ہر پہلو سے یہ بات بٹھائی جائے کہ یہ دنیا ایک خدا کی سلطنت اور ایک خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہاں ہم خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے خدا کی امانت ہے، جو ہمارے حوالے کی گئی۔ اس امانت کے معاملے میں ہم خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ یہاں ہر طرف جدھر بھی نگاہ ڈالی جائے ادھر آیات الہی پھیلی ہوئی ہیں، جو اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ ایک حکمران ہے جو ان سب پر حکومت کر رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لیے جس وقت بچہ داخل ہو اس وقت سے لے کر پرائمری سکول کے آخری مرحلہ تک دنیا سے اس کو آشنا اور روشناس ہی اس طرز پر کیا جاتا رہے کہ ہر سبق کے اندر یہ تصورات شامل ہوں۔ حتیٰ کہ وہ الف سے ایٹم ہم نہ سیکھے بلکہ اللہ سیکھے۔ یہ وہ چیز ہے جو بچوں میں اول روز سے اسلامی ذہنیت پیدا کرنی شروع کر دے گی اور ان کو اس طرح سے تیار کرے گی کہ آخری مراحل تعلیم تک، جب کہ وہ ڈاکٹر بنیں گے، یہی بنیاد اور یہی جڑ کام دیتی رہے گی۔

**دوم** یہ کہ اسلام جن اخلاقی تصورات اور اخلاقی اقدار کو پیش کرتا ہے انہیں ہر مضمون کے اسباق میں، حتیٰ کہ حساب کے سوالات تک میں، طرح طرح سے بچوں کے ذہن نشین کیا جائے، وہ جن چیزوں کو نیکی اور بھلائی کہتا ہے ان کی قدر اور ان کے لیے رغبت اور شوق بچوں کے دل میں پیدا کیا جائے اور وہ جن کو برائی قرار دیتا ہے ان کے لیے ہر پہلو سے بچوں کے دل میں نفرت بٹھائی جائے۔ آج ہماری قوم میں جو لوگ رشوتیں کھا رہے ہیں، جو لوگ بددیانتیاں اور خیانتیں کر رہے ہیں، وہ سب انہی درسگاہوں سے پڑھ کر نکلے ہیں اور آگے جا کر وہی قوم کے ساتھ یہ کچھ بے ایمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو طوطے مینا اور گائے نیل کے سبق پڑھائے گئے تھے۔ اخلاقی سبق نہیں پڑھائے گئے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں ہر طالب کو جو تعلیم دی جائے اس کے اندر اخلاقی مضامین شامل ہوں۔ اس کے اندر حرام طریقوں سے مال کمانے اور کھانے والوں پر سخت تنقید کی جائے اور اس کے برے نتائج بچوں کے ذہن نشین کرائے جائیں۔ اس کے اندر جھوٹ سے، دھوکے اور فریب سے، خود غرضی اور نفس پرستی سے، چوری اور جعل سازی سے، بدعہدی اور خیانت سے، شراب اور سود اور قمار بازی سے، ظلم اور بے انصافی اور لوگوں کے حق مارنے سے سخت نفرت بٹھائی جائے اور بچوں کے اندر ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ جس شخص میں بھی وہ اخلاقی برائیوں کا اثر پائیں اس کو بری نگاہ سے دیکھیں، اور اس کے متعلق برے خیالات کا اظہار کریں۔ یہاں تک کہ انہی درسگاہوں سے فارغ ہو کر اگر آگے کوئی شخص ایسا نکلے جو ان برائیوں میں مبتلا ہو تو اس کے اپنے ساتھی اس کو لعنت ملامت کرنے والے ہوں، نہ کہ داد دینے والے اور ساتھ دینے والے۔

اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ نیکیاں جن کو اسلام انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے، ان کو درسیات میں بیان کیا جائے، ان کی طرف رغبت دلائی جائے، ان کی تعریف کی جائے، ان کے اچھے نتائج تاریخ سے نکال نکال کر بتائے جائیں اور عقل سے ان کے فائدے سمجھائے جائیں کہ یہ نیکیاں حقیقت میں انسانیت کے لیے مطلوب ہیں اور انسانیت کی بھلائی انہی کے اندر ہے۔ بچوں کو دلنشین طریقے سے بتایا جائے کہ وہ اصل خوبیاں کیا ہیں جو ایک انسان کے اندر ہونی چاہئیں اور ایک بھلا آدمی کیسا ہوا کرتا ہے۔ اس میں ان کو صداقت اور دیانت کا، امانت اور پاس عہد کا، عدل و انصاف اور حق شناسی کا، ہمدردی اور اخوت کا، ایثار اور قربانی کا، فرض شناسی اور پابندی حدود کا، اکل حلال اور ترک حرام کا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرنے کا سبق دیا جائے اور عملی تربیت سے بھی اس امر کی کوشش کی جائے کہ بچوں میں یہ اوصاف نشوونما پائیں۔

**سوم** یہ کہ ابتدائی تعلیم میں ہی اسلام کے بنیادی حقائق اور ایمانیات بچوں کے ذہن نشین کر دیئے جائیں۔ اس کے لیے اگر ایک الگ دینیات کے کورس کی ضرورت محسوس ہو تو وہ بنایا جاسکتا ہے، لیکن بہر حال صرف اسی ایک کورس پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان ایمانیات کو دوسرے تمام مضامین میں بھی روح تعلیم کی حیثیت سے پھیلا دیا جائے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہر مسلمان بچے کے دل میں توحید کا عقیدہ، رسالت کا عقیدہ، آخرت کا عقیدہ، قرآن کے برحق ہونے کے عقیدہ، شرک اور کفر اور دہریت کے باطل ہونے کا عقیدہ پوری قوت کے ساتھ بٹھا دیا جائے اور یہ تلقین ایسے طریقے سے ہونی چاہیے کہ بچہ یہ نہ محسوس کرے کہ یہ کچھ دعویٰ اور کچھ تحکیمات ہیں جو اس سے منوائے جا رہے ہیں، بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ یہی کائنات کی معقول ترین حقیقتیں ہیں، ان کا جاننا اور ماننا انسان کے لیے ضروری ہے اور ان کو مانے بغیر آدمی کی زندگی درست نہیں ہو سکتی۔

**چہارم** یہ کہ بچے کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے جائیں اور اس سلسلے میں وہ تمام فقہی مسائل بیان کر دیئے جائیں جو ایک دس برس کے لڑکے اور لڑکی کو معلوم ہونے چاہئیں۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام، وضو کے مسائل، نماز اور روزے کے طریقے، حرام اور حلال کے ابتدائی حدود، والدین اور رشتہ داروں اور ہمسائیوں کے حقوق، کھانے پینے کے آداب، لباس کے حدود، معاشرتی زندگی کے پسندیدہ اطوار، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ان کو صرف بیان ہی نہ کیا جائے بلکہ ایسے طریقے سے ذہن نشین کیا جائے جس سے بچے یہ سمجھیں کہ ہمارے لیے یہی احکام ہونے چاہئیں، یہ احکام بالکل برحق ہیں اور ہم کو ایک ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لیے ان احکام کا پابند ہونا چاہیے۔

### ثانوی تعلیم

اس کے بعد اب ہائی سکول کی تعلیم کو لیجیے۔ اس مرحلے میں سب سے پہلی چیز جسے میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ عربی زبان کو بطور لازمی زبان پڑھایا جائے۔ اسلام کے اصل ماخذ سارے کے سارے عربی زبان میں ہیں، قرآن عربی زبان میں ہے، حدیث عربی زبان میں ہے، ہمارے ابتدائی صدیوں کے فقہاء اور علماء نے جتنا کام کیا ہے ان کی ساری کتابیں بھی عربی زبان میں ہیں۔ اسلامی تاریخ کے اصل ماخذ بھی عربی زبان ہی میں ہیں۔ کوئی شخص اسلام کی سپرٹ پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتا اور نہ پوری طرح سے اس میں اسلامی ذہنیت پیوست ہو سکتی ہے، جب تک کہ وہ قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان میں

نہ پڑھے۔ محض ترجموں سے کام نہیں چلتا۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ ترجمے بھی پھیلیں تاکہ ہمارے عوام الناس کم از کم یہ جان لیں کہ ہمارا خدا ہمیں کیا حکم دیتا ہے لیکن ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو عربی زبان سے ناواقف ہو، اس لیے ہم عربی کو بطور ایک لازمی مضمون کے شامل کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک شخص جب ہائی سکول سے فارغ ہو کر نکلے تو اس کو اتنی عربی آتی ہو کہ وہ ایک سادہ عربی عبارت کو صحیح پڑھ اور سمجھ سکے۔

ثانوی تعلیم کا دوسرا لازمی مضمون قرآن مجید ہونا چاہیے جس کے کم از کم دو پارے ہر میٹرک پاس طالب علم اچھی طرح سمجھ کر پڑھ چکا ہو۔ وقت بچانے کے لیے ایسا کیا جاسکتا ہے کہ ہائی اسکول کے آخری مرحلوں میں عربی زبان قرآن ہی کے ذریعے پڑھائی جائے۔

تیسرا لازمی مضمون اسلامی عقائد کا ہونا چاہیے جس میں طلبہ کو نہ صرف ایمانیات کی تفصیل سے آگاہ کیا جائے بلکہ انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ ہمارے پاس ان عقائد کے دلائل کیا ہیں، انسان کو ان کی ضرورت کیا ہے۔ انسان کی عملی زندگی سے ان کا ربط کیا ہے۔ ان کے ماننے یا نہ ماننے کے کیا اثرات انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں اور ان عقائد پر ایمان لانے کے اخلاقی اور عملی تقاضے کیا ہیں۔ یہ امور ایسے طریقے سے طلبہ کے ذہن نشین کیے جائیں کہ وہ محض باپ دادا کے مذہبی عقائد ہونے کی حیثیت سے ان کو نہ مانیں بلکہ یہ ان کی اپنی رائے بن جائیں۔

اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاقیات کو بھی ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت ثانوی تعلیم میں زیادہ تفصیل اور تشریح کے ساتھ بیان کیا جائے اور تاریخ سے نظریں پیش کر کے یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ اسلام کے یہ اخلاقیات محض خیالی اصول اور نظریے نہیں ہیں بلکہ عملاً اس سیرت و کردار کے لوگ مسلم سوسائٹی میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ میں ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے طلبہ خود ان اوصاف کو برا سمجھیں، ان سے بچیں اور اپنی سوسائٹی میں ان صفات کے لوگوں کو ابھرنے نہ دیں اور اسلام جن اوصاف کو محمود اور مطلوب قرار دیتا ہے ان کو وہ خود پسند کریں، ان کو اپنے اندر نشوونما دیں اور ان کی سوسائٹی میں انہی اوصاف کے لوگوں کی ہمت افزائی ہو۔

میٹرک کے معیار تک پہنچتے پہنچتے ایک بچہ جوان ہو چکا ہوتا ہے اس مرحلے میں اس کو اسلامی زندگی کے متعلق ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت زیادہ تفصیلی احکام جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں اس کو شخصی اور

ذاتی زندگی، خاندانی زندگی اور تمدن اور معاشرت اور لین دین کے متعلق ان تمام ضروری احکام سے واقف ہونا چاہیے جو کہ ایک جوان آدمی کے لیے درکار ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ان احکام کو اتنی تفصیل کے ساتھ جانے کہ مفتی بن جائے لیکن اس کی معلومات اتنی ضرور ہونی چاہئیں کہ وہ اس معیار کی زندگی بسر کر سکے جو ایک مسلمان کا معیار ہونا چاہیے۔ یہ کیفیت تو نہ ہو کہ ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی نکاح و طلاق کے متعلق کوئی علم نہیں ہوتا اور بسا اوقات وہ شدید غلطیاں کر جاتے ہیں اور پھر مسئلہ پوچھتے پھرتے ہیں۔ یا لین دین کے متعلق معمولی مسائل سے بھی ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ناواقف ہوتے ہیں اور اسلامی احکام کے مطابق چلنے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس لیے غلطیاں کرتے ہیں کہ ان کو احکام معلوم نہیں ہوتے۔

تاریخ کی تعلیم میں ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہائی اسکول کا ہر طالب علم نہ صرف اپنے ملک کی تاریخ پڑھے بلکہ اسلام کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ اس کو تاریخ انبیاء سے واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ جان لے کہ اسلام ایک ازلی وابدی تحریک ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں یکا یک شروع نہیں ہوئی تھی اس کو سیرت نبوی اور سیرت خلفائے راشدین سے بھی واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ ان مثالوں سے روشناس ہو جائے جو اس کے لیے معیار انسانیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد سے اب تک کی تاریخ کا ایک مجمل خاکہ اس کے سامنے آ جانا چاہیے تاکہ وہ جان لے کہ مسلمان قوم کن کن مراحل سے گزرتی ہوئی موجود دور تک پہنچتی ہے، یہ تاریخی معلومات نہایت ضروری ہیں۔ جس قوم کے نوجوانوں کو خود اپنے ماضی کا علم نہ ہو اس کے اندر اپنی قومی تہذیب کا احترام کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس تعلیم کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہائی اسکول کے مرحلے میں طلبہ کی عملی تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے۔ مثلاً ہائی اسکول میں کوئی مسلمان طالب علم ایسا نہیں ہونا چاہیے جو نماز کا پابند نہ ہو۔ طلبہ کے اندر ایسی رائے عام پیدا کی جانی چاہیے کہ وہ اپنے درمیان ایسے طالب علموں کو برداشت نہ کریں جو نماز کے پابند نہ ہوں اور از روئے قاعدہ بھی کوئی طالب علم ایسا مدرسے میں نہ رہ سکے جو مدرسے کے اوقات میں نماز نہ پڑھتا ہو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ نماز ہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلامی زندگی قائم ہوتی ہے۔ یہ بنیاد منہدم ہو جانے کے بعد اسلامی زندگی ہرگز قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لحاظ سے بھی آپ کو سوچنا چاہیے کہ ایک طرف آپ ایک طالب علم کو یہ بتاتے ہیں کہ نماز فرض ہے، یہ خدا نے تجھ پر فرض کی ہے۔ دوسری طرف آپ اپنے عملی برتاؤ سے روزیہ بات اس کے ذہن نشین کرتے ہیں کہ اس فرض کو فرض جانتے اور مانتے ہوئے بھی اگر تو ادا نہ کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آپ اسے

روزانہ منافقت کی اور ڈیوٹی سے فرار کی اور ضعف سیرت کی مشق کر رہے ہیں۔ کیا آپ امید رکھتے ہیں کہ یہ تعلیم و تربیت پا کر جب وہ نکلے گا تو آپ کے تمدن اور آپ کی ریاست کا فرض شناس کارکن ثابت ہوگا؟ جی نہیں! ایک فرض کی چوری میں مشاق ہو کر وہ پھر دوسرے فرائض میں سے چرائے گا۔ اسٹیٹ کے فرائض میں سے چرائے گا۔ ہر فرض کے اندر سے کچھ نہ کچھ چوری کر کے رہے گا۔ اس صورت میں آپ کو اسے ملامت نہ کرنی چاہیے بلکہ اس نظام تعلیم کو ملامت کرنی چاہیے جس نے اول روز سے اس کو یہ سکھایا تھا کہ فرض ایک ایسی چیز ہے جس کو فرض جاننے کے بعد بھی چھوڑا جاسکتا ہے۔ اپنے نوجوانوں کو خدا سے بے وفائی سکھانے کے بعد آپ یہ ہرگز امید نہ رکھیں کہ وہ قوم، ملک، ریاست کسی چیز کے بھی مخلص اور وفادار ہوں گے۔ تعلیم کے کورس میں بلند خیالات اور معیاری اوصاف بیان کرنے کا آخر فائدہ ہی کیا ہے اگر سیرت و کردار کو ان خیالات اور معیارات پر قائم کرنے کی عملاً کوشش نہ کی جائے۔ دل میں اونچے خیالات رکھنے اور عمل ان کے خلاف کرنے سے رفتہ رفتہ سیرت کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی سیرت ہی بودی اور کھوکھلی ہو وہ مجرد اپنی ذہنی اور علمی قابلیتوں سے کوئی کارنامہ کر کے نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے ہمیں ثانوی تعلیم کے مرحلے میں، جب کہ نئی نسلیں بچپن سے جوانی کی سرحد میں داخل ہوتی ہیں، اس امر کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ایک ایک لڑکے اور لڑکی کے اندر مضبوط سیرت پیدا کریں اور انہیں یہ سکھائیں کہ تمہارا عمل تمہارے علم کے مطابق ہونا چاہیے۔ جس چیز کو حق جانو اس کی پیروی کرو، جسے فرض جانو اسے ادا کرو، جسے بھلائی جانو اسے اختیار کرو، اور جسے برا جانو اسے ترک کر دو۔

خالق سے مانگنا عزت کی بات ہے۔ اگر دے تو رحمت، نہ دے تو حکمت

مخلوق سے مانگنا ذلت ہے۔ اگر دے تو احسان، نہ دے تو شرمندگی



## اسلامی اداروں کی تیار کردہ غیر موثر اسلامی نصابی کتب 'آفاق' کی نصابی کتب کا ایک جائزہ

کراچی یونیورسٹی کے معروف اسلامی دانشور جناب سید خالد جمعی نے البرہان کے چند گزشتہ شماروں میں اسلامی سکولوں میں پڑھائی جانے والی درسی کتب کا تجزیہ کر کے بتایا کہ ہم اپنے بچوں کو جو تدریسی مواد دے رہے ہیں وہ نظریاتی اور نفسیاتی سطح پر ہمارے دین، ہماری ثقافت اور ہماری معاشرت کے لیے ناقابل قبول ہے۔ خصوصاً وہ سکول جو اپنے آپ کو اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا علم بردار کہتے ہیں، وہ جو درسی کتب استعمال کر رہے ہیں وہ اُن کے دعویٰ کی تردید کرتی ہیں۔ ہمارے ملک کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم ہر سطح پر تضاد کا شکار ہیں۔ اسلامی ذہن کے حامل خواتین و حضرات جو سکول چلا رہے ہیں وہ ایک طرف تو کچھ اسلامی دعائیں یاد کراتے ہیں۔ ہم نصابی سرگرمیوں میں اسلامی ٹیبلو طرز کی سرگرمیاں بھی کراتے ہیں، بعض سکولوں میں ناظرہ قرآن اور حفظ قرآن کا انتظام بھی ہوتا ہے لیکن اپنے طلبہ کو جو تدریسی کتب اور تدریسی مواد دیتے ہیں وہ وہی ہوتا ہے جو دیگر لبرل اور سیکولر سکول اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ اس سے مطلوبہ تعلیمی اور تربیتی نتائج تو کیا پیدا ہوں گے اُلٹا طلبہ کی شخصیتوں میں تضاد اور شمولیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اسلامی سکولوں میں ایسا نصاب اور ایسی درسی کتب پڑھائی جائیں جو اسلامی نظریہ حیات کے ثقافتی اور تصوراتی تقاضوں کے مطابق لکھی گئی ہوں۔

ماضی قریب میں علم اور درسی کتب کو اسلامیانے کا تصور ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم نے دیا۔ مولانا سید مودودیؒ نے بھی تعلیم کے حوالے سے اپنی تحریروں میں اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا۔ تنظیم اساتذہ پاکستان اس تصور کی سب سے بڑی حمایتی رہی ہے۔ ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی اور ان کی ٹیم نے امریکہ میں ٹرپل آئی ٹی (IIIT) کے پلیٹ فارم پر قابل قدر اضافے کیے۔ ان تمام کاوشوں کے باوجود کم از کم اسلامی سکولوں کی حد تک درسی کتب کی اسلامی موزونیت کے حوالے سے معاملہ نشنہ رہا ہے۔ ہماری نظر میں اردو اور انگریزی کی درسی کتب کا مواد اسلامی حوالے سے بڑا موثر اور مضبوط ہونا چاہیے۔ معاشرتی علوم کی کتب کو اسلامی معاشرت اور ثقافت کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ ریاضی کی درسی کتب میں سکول

کی سطح پر عمارتی سوالات کے ذریعے سے اسلامی تناظر دینا بہت ضروری ہے۔ رہ گئی سائنس تو یہ تو انفس و آفاق کا علم ہے۔ اس میں کائنات میں کارفرما طبعی، کیمیائی اور حیاتیاتی حقائق اور قوانین و نظریات ہی زیر بحث لائے جاتے ہیں جو قرآنی اصطلاح میں آیات الہی یا اللہ کی نشانیاں ہیں۔ اس طرح سائنس میں تو اس کائنات کے خالق، مالک اور رازق کا ذکر کیے بغیر کوئی موزوں تعلیم ممکن ہی نہیں۔ تصورِ الہ جس قدر آسانی سے سائنس کی درسی کتب میں اُجاگر کیا جاسکتا ہے اتنا کسی اور شعبہ علم میں ممکن نہیں۔ ہماری ان گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ درسی کتب کا اسلامی تناظر نہ صرف مطلوب ہے بلکہ ممکن اور آسان بھی ہے بشرطیکہ فیصلہ ساز، مصنفین اور ایڈیٹرز اپنی درسی کتب کی پالیسی میں اس بات کو وزن دیں۔

ہم نے سطورِ بالا میں درسی کتب کے اسلامی تناظر میں جن خیالات کا ذکر کیا ہے اگر ان کی روشنی میں پاکستان میں مروج درسی کتب پر نظر ڈالیں تو مایوسی ہوتی ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی شائع کردہ درسی کتب اور دیگر غیر ملکی ناشرین کی درسی کتب تو رہیں ایک طرف مقامی ناشرین کی درسی کتب بھی کوئی حوصلہ افزا منظر پیش نہیں کرتیں۔ کراچی میں متعدد ناشرین ہیں جو مختلف سطح کے سکولوں کے لیے درسی کتب شائع کرتے ہیں سطحیت، چربہ سازی اور سرفی پاؤڈر کے علاوہ اُن میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ہماری توجہ پچھلے دنوں آفاق ٹیکسٹ بکس کی طرف گئی اس لیے کہ کراچی کے اسلامی سکولوں اور دیگر لبرل سکولوں کی ایک قابل ذکر تعداد آفاق کی شائع کردہ درسی کتب استعمال کر رہی تھی۔ آفاق کی دوسریز، اقبال سیریز اور سن سیریز (Sun Series) ہماری نظر سے گزریں۔ اقبال سیریز متوسط درجے کے سکولوں کے لیے ہے اور سن سیریز مہنگے سکولوں کے لیے ہے۔ ہمیں جب یہ بتایا گیا کہ آفاق ٹیکسٹ بکس شائع کرنے والے ادارے کے کرتا دھرتا ایک اسلامی جماعت سے منسلک لوگ ہیں تو ہمیں احساس ہوا کہ درسی کتب کی یہ سیریز یقیناً اسلامی نقطہ نگاہ سے لکھی گئی ہوں گی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اس کے کرتا دھرتا اسلامی جماعت سے منسلک لوگ ہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ جماعت سے منسلک لوگوں کے سکولوں میں یہ کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ ہم نے اپنے مفروضہ کا جائزہ لینے کے لیے بازار سے چھٹی سے آٹھویں تک کی اردو، انگریزی، ریاضی، سائنس اور معاشرتی علوم کی کتابیں خرید کر پڑھنا شروع کر دیں۔ پہلا صدمہ تو ہمیں یہ ہوا کہ مذکورہ درسی کتب کی قیمتیں معقول حد سے بہت زیادہ ہیں لیکن چلیے یہ تو تجارتی پہلو ہے اور ہم اس پر زیادہ بات نہیں کرتے۔ رہ گئی بات نظریات اور اسلامی تناظر کی تو اس سلسلہ میں ہمارے مشاہدات حسب ذیل ہیں:

۱- معاشرتی علوم کا مضمون ایسا ہے کہ جس کے ذریعے سے انصافی فریم ورک کے اندر رہ کر بھی اور انصاف میں کچھ اضافے کر کے اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی اخلاق و عادات کی بچوں میں ترویج ممکن ہوتی ہے۔ آفاق کی چھٹی سے آٹھویں جماعت کی معاشرتی علوم کا جب مطالعہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ لبرل سیکولرناشرین کی طرح اسلام سے مکمل اجتناب کیا گیا ہے۔ آٹھویں جماعت کے کتابی مواد میں قدرتی آفات از قسم زلزلے، سیلاب وغیرہ پر پورا باب ہے۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق آفات ارضی و سماوی آیات الہی میں شامل ہیں اور ان کا نزول انسانوں کے اعمال کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے۔ درسی کتب میں اس موضوع پر بات کرتے ہوئے جہاں ان کی سائنسی توجیح دی جائے وہاں قرآنی تعلیمات کے مطابق ان سے متعلق انسانی اعمالی پہلو کا ذکر بھی ضروری ہے لیکن آفاق کے اسلامی ذہن نے اس موضوع کو خالصتاً سیکولر انداز میں ڈیل کیا ہے۔ ہم نے اپنے تحفظات کی سپورٹ میں بس یہ ایک مثال پیش کی ہے ورنہ معاشرتی علوم کی درسی کتب میں اسلام کے حوالے سے بہت کچھ کیا اور کہا جاسکتا ہے۔

۲- ریاضی کی درسی کتب میں کوئی ایک بھی ایسا مقام نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ان درسی کتب کو شائع کرنے والے ادارے کے ذمہ داران کا تعلق کسی اسلامی نظریاتی تحریک سے ہے۔ جمع تفریق ضرب تقسیم، اوسط اور فیصد کے عبارتی سوالات میں اسلامی پس منظر کی مثالوں کو شامل کرنا چنداں مشکل نہیں تھا۔

۳- سائنس کی درسی کتب کا مواد طبعی کائنات کے حقائق اور اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ کائنات کا خالق اور مالک اللہ کی ذات ہے اور کائنات میں کارفرما حقائق اور قوانین اللہ ہی کے دیے ہوئے ہیں جنہیں انسان اللہ کے دیے ہوئے علم اور عقل کو کام میں لا کر منکشف کرتا ہے۔ سائنس کے حقائق اور اصولوں کو بیان کرتے ہوئے انہیں اللہ کی طرف منسوب کرنے سے بچوں کے ذہن میں خالق کائنات کا تصور اور الہ العالمین کے ساتھ جڑنے کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ قرآن حکیم اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے نفس و آفاق میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اسلامی ذہن کا مصنف جب سائنس کی درسی کتب لکھے گا تو اسے اس کا خیال رکھنا چاہیے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آفاق ٹیکسٹ بکس کے ذمہ داران نے اس سلسلہ میں وہی لبرل سیکولر رویہ اختیار کیا ہے جو دیگر ملکی اور غیر ملکی ناشرین اور ان کے لکھاری اختیار کرتے ہیں۔ کاش وہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی لکھی ہوئی فوکس برائے میٹرک کلاسز کا مطالعہ کر لیتے۔

۴۔ انگلش کی ٹیکسٹ بکس کے حوالے سے دیباچے (Preface) میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان کتب میں مواد تدریجی ذخیرہ الفاظ (Graded Vocabulary) کو مد نظر رکھ کر پیش کیا گیا ہے نیز اس میں پاکستانی اور اسلامی پس منظر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کتب کے شروع کے صفحات میں ایک جدول دیا گیا ہے جس میں ہر سبق کے حوالے سے مقاصد کا بیان ہے۔ ان میں Ethical Values and Ideas کا ایک کالم بھی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان دعووں کی تکمیل کے لیے اندرونی صفحات میں کوئی کاوش نہیں کی گئی۔ اکثر اسباق انگریز مصنفین (English Authors) کے (Adapted Versions) ہیں ان میں بچیوں اور خواتین کو سر پر سکارف پہنا دیا گیا ہے۔ عجیب تضاد نظر آتا ہے کہ نفس مضمون کا پورا تناظر یورپی ہے اور تصاویر کو پاکستانی رنگ دے دیا گیا ہے۔ اس سے نفع طلبہ کے ذہنوں میں کنفیوژن لازمی پیدا ہوگی۔ اسباق کے انتخاب میں کوئی معنویت نظر نہیں آتی۔ مطالعاتی مواد ہم جیسے بالغ ذہنوں کو کنفیوژ کرتا ہے وہ بچوں کو کیسے کوئی واضح تصور دے گا۔ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہونے کے تصور کے برعکس اسے سائنس کا مرہون منت بتایا گیا ہے۔ آٹھویں جماعت کے سبق نمبر 8 میں جس کا عنوان ہے The Last Leaf میں ایک بیمار لڑکی کے حوالے سے ڈاکٹر کی زبان میں کہلایا گیا ہے کہ (I will do all that science can accomplish) یعنی میں لڑکی کو بچانے کے لیے وہ سب کچھ کروں گا جتنا کہ سائنس کر سکتی ہے۔ یہاں یہ کہا جاسکتا تھا کہ سائنس کا علم علاج معالجہ میں جو کچھ کر سکتا ہے میں کروں گا لیکن زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مصنفین کا مسئلہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے اسباق کا انتخاب انگریز مصنفین کی تحریروں سے کیا ہے اور ظاہر ہے تناظر تو وہی رہے گا جو انگلش رائیٹرز کا ہوتا ہے۔ ایک اور خرابی یہ ہے کہ ذخیرہ الفاظ بہت مشکل اور اسباق کا تصور راتی ڈھانچے طلبہ کے ذہنی معیار سے لاتعلقی ہے۔ نظمیں (Poems) بھی ساری کی ساری انگلش رائیٹرز کی ہیں حالانکہ اسلامی تناظر میں لکھی نظموں کے اب بہترین مجموعے دستیاب ہیں جو بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق بھی ہیں اور نظریاتی طور پر سبق آموز بھی ہیں۔ آفاق کے فیصلہ سازوں نے اسلامی نقطہ نگاہ سے لکھی گئی English Rhymes کو بالکل نظر انداز کیا ہے۔

انگلش کی درسی کتب کا سرسری مطالعہ ہی اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ آفاق انگلش سیریز کو ہمارے اسلامی سکولوں کے اساتذہ کے لیے پڑھانا نہ آسان ہے اور نہ ہی با مقصد۔ ہر سبق کے آخر میں تمرینات (Exercises) کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس کا متعلق سبق کے مندرجات سے کوئی مربوط تعلق نظر نہیں آتا اور نہ ہی سبق واد مشقوں کا کوئی آپس میں تدریجی تعلق معلوم ہوتا ہے۔

۵۔ اردو کی درسی کتب کو دیکھ کر ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ ان کتب کے اسباق میں نظریہ کی جھلک نمایاں ہے۔ غالباً اس کی وجہ حفیظ الرحمن احسن مرحوم ہیں جو ایک صاحب طرز ادیب اور مسلم دانشور تھے اور جنہوں نے اردو کی درسی کتب میں بطور ایڈیٹر کام کیا۔

۶۔ ہم نے سرسری طور پر آفاق درسی کتب کا آکسفورڈ درسی کتب اور سرکاری ٹیکسٹ بک بورڈ کی درسی کتب کے ساتھ موازنہ کی کوشش کی۔ سچی بات یہ ہے کہ سرکاری ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتب کم از کم پاکستانی اور اسلامی تناظر کے حوالے سے بہتر پائی گئیں جب کہ آفاق کی درسی کتب اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی درسی کتب میں ہمیں کوئی قابل ذکر فرق نظر نہیں آیا سوائے اس کے کہ آفاق کے کارپردازان نے دعوے کی حد تک پاکستانی اور اخلاقی تناظر کا لحاظ رکھنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر کسی تھرڈ پارٹی کے محققین یا تجزیہ کار آفاق درسی کتب، سرکاری ٹیکسٹ بک بورڈ کی درسی کتب اور آکسفورڈ کی درسی کتب کا علمی اور پیشہ ورانہ بنیادوں پر موازنہ کریں اور درسی کتب کے سلسلہ میں سائنسی بنیادوں پر قوم کی راہنمائی کریں۔

۷۔ ہمارے لیے اچنبھے کی بات اس وقت سامنے آئی جب بلوچ کالونی کراچی کے ایک بڑے سکول کے ذمہ دار نے بتایا کہ 9/11 سے پہلے آفاق درسی کتب کا جو پہلا ایڈیشن آیا تھا اس میں اسلامی تناظر کا بہت حد تک خیال رکھا گیا تھا اور تمام مضامین کی درسی کتب نمایاں طور پر دیگر مروج درسی کتب سے اسلامی نظریاتی حوالوں سے بالکل مختلف تھیں۔ یہ شاید 9/11 کے بعد کے حالات کا شاخصانہ ہے کہ آفاق درسی کتب کے فیصلہ سازوں نے اپنے سابقہ تصورات سے رجوع کر لیا ہے۔

اے پیرِ حرم، رسم و رہِ خانقہ چھوڑ  
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا  
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت  
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا  
تو ان کو سکھا خارا شگانی کے طریقے  
مغرب نے سکھایا انہیں فنِ شیشہ گری کا  
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی  
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

## قضیہ یمن ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

۱۔ ملی مجلس شرعی کے کئی سال تک جنرل سیکرٹری کے طور پر کام کرنے کے نتیجے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جب کوئی نزاعی مسئلہ اٹھ کھڑا ہو اور کچھ علماء ایک نقطہ نظر کے زبردست حامی ہوں اور دوسرے سخت مخالف ہوں تو ہم جیسے اتحاد امت اور اتحاد بین العلماء کے علمبرداروں کو مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ہم اگر ذاتی طور پر کوئی موقف رکھتے بھی ہوں تو ہم نہ کھل کر حق کی حمایت کر سکتے ہیں اور نہ غلطی کی کھل کر مذمت کر سکتے ہیں کیونکہ ہمیں تو متحاربین کو لڑنے سے منع کرنا ہوتا ہے اور ان کو قریب لانا اور ان کے درمیان خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرنا ہوتا ہے چہ جائیکہ ہم خود فریق بن جائیں۔ ماضی میں شیعہ سنی قتل و غارت اور طالبان کے مسئلے میں ہم اس کا تجربہ کر چکے ہیں..... اور پھر یہ کہ اختلافات و کشمکش کو ابھارنے والے اندرونی و بیرونی عوامل بعض اوقات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ ہم جیسے اتحاد کی خواہش و کوشش کرنے والے عموماً کچھ کر بھی نہیں پاتے۔

۲۔ یہی حال قضیہ یمن کا ہے کہ ہمارے سلفی بھائی سعودی عرب کے حق میں ایک انتہائی موقف اختیار کر چکے ہیں جب کہ دوسری جانب اہل تشیع ایرانی پالیسیوں کی حمایت کر رہے ہیں۔ اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ ایرانی موقف مخدوش اور قابل اصلاح ہے اور سعودی موقف اپنا جواز رکھتا ہے لیکن ہم اسے حق و باطل کی جنگ قرار دے کر ایک فریق کی حمایت اور دوسرے کی مذمت کرنے کی بجائے دونوں فریقوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہیں گے کہ ایمان اور فراست کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس پر غور کریں کہ ان کو لڑانے والا اور ان کی باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھانے والا کون ہے؟ یہ دونوں ممالک اگر اپنا بے لاگ احتساب کریں اور اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کریں تو شاید خیر و صلاح کا کوئی راستہ نکل آئے۔

دریں اثناء ہم یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ دونوں ممالک کی پالیسیوں کا اس طرح تجزیہ کریں کہ ان میں مغربی استعمار کے ہاتھوں استعمال ہونے کا احساس اجاگر ہو اور وہ اپنی اصلاح کی سوچیں۔

۲۔ ایران میں جب اسلامی انقلاب آیا اور وہ ایک مغرب پرست حکومت کے خلاف تھا لہذا ایران میں شیطان بزرگ امریکہ اور مرگ بر امریکہ کے نعرے گونجے۔ امریکہ نے مزاحمت کی۔ عراق

ایران جنگ کرائی..... تاہم امام خمینی کے انتقال کے بعد جب حالات ذرا ٹھنڈے ہوئے تو امریکہ اور ایران دونوں کو اپنے مفادات یاد آئے۔ ایران کا مفاد یہ تھا کہ اس کا انقلاب وسعت اختیار کرے، اس کا اثر و رسوخ بھی بڑھے اور تشیع بھی پھیلے۔ امریکہ کا مفاد یہ تھا کہ مسلمانوں میں شیعہ سنی اختلاف کو تفرقے اور تعصب کی بنیاد بنایا جائے، سنی شیعہ کوڑا یا جائے اور دونوں کے علمبردار ممالک میں حریفانہ کشمکش کو فروغ دے کر انہیں ایک دوسرے کے مد مقابل لایا جائے، انہیں اسلحہ بیچا جائے، ان سے مال نکلوا یا جائے اور ان پر سیاسی، دفاعی، معاشی دباؤ برقرار رکھ کر ان کے ہاں قدم مزید مضبوطی سے جمائے جائیں۔ چنانچہ اس نے تباہ کن کیمیائی ہتھیاروں کا جھوٹا پروپیگنڈا کر کے عراق پر حملہ کیا، وہاں صدام کی آمرانہ سنی حکومت کو روندنا اور جمہوریت کے نام پر شیعہ اکثریت کی حکومت قائم کر دی۔ یہ چیز امریکہ و ایران میں خاموش مفاہمت کا سبب بنی۔ عراق کی شیعہ حکومت نے ایرانی اشیر باد سے سنی مسلمانوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم کیا تو رُبع عمل میں داعش ابھری اور اس کے پنپنے میں امریکہ نے بھی مدد دی جس کے خلاف ایران عراقی حکومت کی مدد کر رہا ہے اور امریکہ خود بھی داعش پر حملہ آور ہے کیونکہ وہ خلافت کی مدعی ہے جو اسے کو کسی قیمت پر قبول نہیں۔

ایران شام، بحرین، یمن، سعودی عرب، کویت، لبنان اور پاکستان و افغانستان میں شیعہ اقلیتوں کے ساتھ تعاون اور ان کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ شام میں اکثریتی اہل سنت کے مقابلے میں وہ اقلیتی اور ظالم و جاہل شیعہ حکومت کا افرادی، مالی، اسلحی، سیاسی ہر لحاظ سے ساتھ دے رہا ہے۔ اسی طرح یمن میں اس نے بہت معمولی اقلیت کے حامل حوثیوں کو برسوں اسلحہ، ڈالر اور تربیت دے کر انہیں اس قابل کیا ہے کہ وہ یمن پر قبضہ کرنے کے بعد ہمسایہ سعودی حکومت کو چیلنج کرنے لگے ہیں۔ باقی ملکوں میں بھی شیعہ اقلیتیں بمشکل ہی صبر کیے ہوئے ہیں بلکہ اکثر جگہوں پر ان کے مخالف گروپ انہیں ایرانی حمایت اور ان کی عملی مدد کے لیے ایران کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔

۴۔ اس میں شک نہیں کہ سعودی عرب اپنے معروف دینی پس منظر کے ساتھ بہت سے شعبوں میں دینی تعلیمات نافذ کیے ہوئے ہے اور اپنے ہم خیالوں کی دنیا بھر میں مالی معاونت کرتا ہے۔ پاکستان کے ساتھ اس کے خصوصی مجاہدہ مراسم ہیں (جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں امریکہ و یورپ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں) تاہم سعودی عرب کے مخالف بلکہ غیر جانبدار دانشور اور تجزیہ کار بھی سعودی عرب کے خلاف ایک لمبی چارج شیٹ رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ سعودیہ شروع ہی سے امریکی و یورپی استعمار کا

حاشیہ نشین ہے۔ اس نے (اور علاقے کی چھوٹی ریاستوں نے) پٹروڈالر کا صحیح استعمال نہیں کیا اور اسے الٹے تلے میں اڑا دیا، نہ اپنی فوج مستحکم کی اور نہ معیشت اور نہ اس نے مسلم ممالک کی معاشی بہتری کے لیے کوئی منظم اور خاطر خواہ کوشش کی، بلکہ مغربی دباؤ میں آ کر اپنا سارا سرمایہ امریکی و یہودی بنکوں میں رکھا۔ امریکہ و یورپ مسلسل اس کو ڈرا دھمکا کر، مقامی جنگوں میں ملوث کر کے اور حریفوں کو اس کے خلاف کھڑا کر کے اسے لوٹتے رہے بلکہ امریکہ نے اپنی فوجیں دہران میں اتار کر تیل کے علاقے پر بالواسطہ قبضہ کر رکھا ہے۔ سعودیہ نے امریکی اشارے پر اور اس کے مفادات کے تحت مصر میں الاخوان المسلمون کی مخالفت کی اور وہاں لادین فوجی حکومت کی حمایت کی۔ شام میں وہ امریکی مفادات کے تحت محارب دھڑوں کی مدد کر رہا ہے۔ سعودی حکمران مومن کی فراست سے اتنے دور ہیں کہ ایک طرف امریکی چنگل سے نہیں نکل سکے اور دوسری طرف داخلی پالیسیوں میں کشادگی پیدا کر کے مقامی سیاسی قوتوں کو اپنے ساتھ نہیں ملا سکے بلکہ اندرون سعودی عرب پولیس سٹیٹ کی سی کیفیت ہے اور عوام کو حکومتی سرگرمیوں میں شریک نہیں کیا جاتا۔ اسلامی کانفرنس تنظیم کی غیر فعالیت کے لیے بھی وہ سعودی عرب کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔

مندرجہ بالا تجزیے سے ظاہر ہے کہ قضیہ یمن میں ایران زیادتی کر رہا ہے اور سعودی عرب کی اپنے دفاع کے لیے پریشانی بجائے لیکن دونوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ مغرب ان دونوں کو لڑا رہا ہے اور اپنا الو سیدھا کر رہا ہے۔

۶۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس صورت حال کا حل کیا ہو؟ اس کا حل قرآن مجید میں موجود ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ہماری یہ رہنمائی فرمائی ہے کہ جب دو مسلمان گروہوں میں لڑائی ہو جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان میں صلح و صفائی کی کوشش کریں اور معاملے کو قرآن و سنت کی طرف لوٹائیں۔ پھر اگر صلح نہ ہو سکے اور مصالحت کنندگان اس نتیجے پر پہنچیں کہ فلاں فریق زیادتی کر رہا ہے اور صلح پر آمادہ نہیں ہو رہا تو سب کا فرض ہے کہ مل کر زیادتی کرنے والے کے خلاف لڑیں اور اسے حق بات ماننے پر مجبور کریں۔ لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ عالم اسلام میں کوئی ایک ادارہ بھی ایسا نہیں جس کی طرف لوگ رجوع کریں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ آج اسلامی کانفرنس تنظیم کو موثر اور فعال نہ بنانے کا خمیازہ خود سعودی عرب کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اب ایک ہی صورت بچی ہے کہ جن مسلمان ممالک کو بوجہ اس معاملے سے دلچسپی ہے مثلاً پاکستان، ترکی وغیرہ وہ متحرک کردار ادا کریں بلکہ انہیں چاہیے کہ اسلامی کانفرنس تنظیم کا اجلاس بلائیں اور فعال کردار ادا کر کے ایران سے کہیں کہ وہ اپنی



پالیسیوں پر نظر ثانی کرے۔ یمن میں جنگ بندی کرا کے متحارب گروپوں میں سیاسی معاہدہ کرایا جائے اور اس پر عمل درآمد کرایا جائے۔

۷۔ اس ضمن میں ہمارا اور پاکستان کا کردار کیا ہونا چاہیے؟

☆ ظاہر ہے ہمارے سمیت ہر پاکستانی تحفظ حرمین شریفین کے لیے اپنی جان قربان کرنا اعزاز سمجھتا ہے۔

☆ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ سعودی عرب کی ہر ممکن مدد کرے خصوصاً اس تناظر میں بھی کہ اس کا ہاتھ ہم مسلمان بھائی پکڑیں اور اسے امریکہ و یورپ کے زیر دام نہ آنا پڑے۔

☆ پاکستان کو چاہیے کہ دوست ممالک کو ساتھ ملا کر اسلامی کانفرنس تنظیم کو متحرک کر کے ایران اور سعودی عرب کو ایک میز پر بٹھائے اور ان کے درمیان صلح صفائی کرائے۔ مسئلہ یمن کا کوئی سیاسی حل نکالا جائے اور اس پر عمل درآمد کرایا جائے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت پاکستان اس سے تغافل برت رہی ہے اور اس معاملے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو رہی، جس سے معاملات کے بگڑ جانے کا قوی امکان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ

خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

ضم کدہ ہے جہاں، لا الہ الا اللہ

کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا

فریب سود و زیاں! لا الہ الا اللہ

یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند

بتان و ہم و گماں لا الہ الا اللہ

## انسانوں کا کاروبار - آخر کب تک؟

اسلامی ممالک میں خفیہ عالمی قوتوں کا اثر و رسوخ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ عافیہ صدیقی کی المناک گرفتاری اور مضحکہ خیز مقدمے اور انصاف کی تفصیل، بلیک وائر کارپوریشن کو دن دیہاڑے چشم دید قتل کے باوجود رہا کروالینا اور ڈاکٹر شکیل آفریدی کا ایک معروف این جی او (سیودی چلڈرن) کی چھتری کے نیچے بچوں کو بچانے کی غدارانہ مہم انجام دینا..... یہ چند واقعات ہی ایک محب وطن پاکستانی کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہیں۔

جین مار کی کتاب 'اندھیری طرف' (دی ڈارک سائیڈ) کے مطابق پاکستان میں صرف ۲۰۰۸ء میں جو گرفتاریاں ہوئیں اس میں کروڑوں ڈالر کی رشوت ادا کی گئی۔ اس سال صرف اسلام آباد میں ڈھائی سو گھرانہ نام نہاد "سپر پاور کی سپر ایجنسی" کے استعمال میں تھے۔

اسامہ بن لادن کے خلاف ایبٹ آباد آپریشن کے بارے میں پاکستانی عدالتی کمیشن کی رپورٹ بھی کافی چشم کشا تھی۔ جنرل عزیز نے بھی "یہ خاموشی کب تک" لکھ کر قوم پر بظاہر احسان کیا اور اپنی بے چینی کو اطمینان سے بدلنے کی کوشش کی۔ نائین الیون کے بعد بیرونی مداخلت کا پہلا واضح اظہار جنرل پرویز نے اپنی کتاب "ان دی لائن آف فائر" میں فخریہ انداز میں کر دیا تھا۔

مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کا یہ طریقہ استعماری قوتوں کا وہ ہتھکنڈہ ہے جسے وہ پاکستان میں انتہائی چابکدستی سے استعمال کر رہے ہیں۔ اس وقت دنیا میں نام نہاد "عالمی طاقت" کی خفیہ جیلوں اور عقوبت خانوں کی تعداد ہزاروں میں ہے جو کالے مقامات (بلیک سائٹس) کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ سی آئی اے کے ڈیڑھ لاکھ ٹھیکیدار (کنٹریکٹرز) دنیا بھر میں برسرِ پیکار ہیں۔ ان کی ظالمانہ کارروائیوں کی روئیداد گاہے بگاہے اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہے۔

دنیا بھر میں قائم ایسے عقوبت خانوں میں محبوس ایسے شخص کو اس دھس بے جا میں رکھنے کے کم از کم دس ڈالر یومیہ وصول کیے جاتے ہیں۔ تیسری دنیا میں ان خفیہ جیلوں میں ایسے قیدی پرزیدہ سے زیادہ چار پانچ ڈالر خرچ آتا ہے۔ جب کہ باقی پانچ چھ ڈالر اوپر تک مختلف مراحل میں منظور نظر سیاستدانوں اور

افسروں کی جیب میں چلے جاتے ہیں۔

اگر کسی ملک میں دس ہزار ایسے ”لاپتہ“ افراد ہوں تو ان کے ایک لاکھ ڈالر یومیہ اخراجات کا آدھا (تقریباً پچاس ہزار ڈالر) ان انسانی کاروبار کرنے والے ظالم تاجروں کی غنیمت ہوتی ہے۔

اس دور میں انسانوں کا انسانوں پر بدترین ظلم یہی ”انسانی کاروبار“ ہے جس میں انہیں جبری اغوا کر کے اندھیرے عقوبت خانوں کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ کسی شخص کے قتل ہو جانے یا پھانسی چڑھ جانے یا عدالتی نظروں میں عمر قید ہو جانے سے قریبی رشتے دار (ماں باپ بیوی بچے) آٹھ دس روز دھوکہ صبر کر لیتے ہیں لیکن لاپتہ افراد کے لواحقین برسوں شدید ذہنی کوفت میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ اذیت ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس کا نوعمر بچہ چند لمحوں کے لیے کسی بھیڑ میں گم ہو جائے۔ یہ چند لمحوں کی جدائی اسے شدید بے چینی، کرب اور موہوم خدشات میں مبتلا کر دیتی ہے۔

لاپتہ افراد کی خواتین بچوں کا معاشی بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک چکی ہیں۔ مائیں اپنے بچوں، خصوصاً بچیوں کے تحفظ کے بارے میں شدید فکر مند ہیں۔ جو قانون انسانوں کو تحفظ فراہم نہیں کر سکتا، اسے سزا دینے کا بھی حق حاصل نہیں ہوتا۔ دنیا کے تمام ممالک کے آئین انسانوں کو انسانوں کے تسلط سے نکال کر آزادی سے رہنے کا حق دیتے ہیں۔ ان کے جان و مال و عزت و آبرو کا تحفظ یقینی بناتے ہیں۔ تیسری دنیا میں ذرائع ابلاغ (میڈیا) کا کردار اس تناظر میں منفی رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ اس پر عالمی استعماری طاقتوں کا اثر و رسوخ ہے۔ بسا اوقات ایسے مظالم کو منظر عام پر لانے والوں کو رستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ عوامی سطح پر ”لاپتہ افراد“ کے مسئلے کے بارے میں آگاہی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ عوام و خواص کا فرض بنتا ہے کہ معاشرے میں موجود لاپتہ افراد کے لواحقین کو خوف اور بے بسی کے عالم سے نکال کر معاشرے میں عزت و وقار سے جینے دیا جائے اور ان کے پچھڑے ہوئے پیاروں کو واپس لانے کی تدبیر کی جائے۔

آج مسلم معاشروں کے مفکرین، دانشور، کالم نگار اور اینکرز وہی ڈگڈگی بجا رہے ہیں جسے بنیامین نیتن یاہو (اسرائیلی وزیراعظم) نے ۱۹۹۰ء میں اپنی کتاب ”فائینگ ٹیررز“ میں تخلیق کیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ دنیا بھر کی اقوام ”اسلامی بنیاد پرستی“ کے عفریت کو ابھی سے کچل ڈالیں، اگر وہ اقوام (امریکہ، یورپ، روس اور انڈیا) ایسا نہیں کرتیں تو وہ خود کچلے جانے کے لیے تیار رہیں۔

نائین الیون کے بعد عالمی استعمار کا کلیدی بیان یہی تھا کہ وہ ”اسلام سے جنگ نہیں چاہتے بلکہ اسلام کے اندر جنگ چاہتے ہیں“ اسی لیے نائین الیون کمیشن رپورٹ (سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ) میں آئندہ عالمی جنگ کے خدوخال متعین کرتے ہوئے پورے عالم کو آزادی، مواقع اور جمہوریت کے نعروں کے ساتھ اتحادی بنایا گیا۔

اس سے اگلی حکمت عملی میں راسخ العقیدہ (قرآنی تعلیم سے براہ راست وابستہ اسلامی بنیاد پرست) اداروں اور افراد کو بے اثر بنانا ہے۔ اس کے لیے وضع کی گئی حکمت عملی میں ان کا مکمل خاتمہ (نیوٹرلائز: Neutralise) کرنا، مکمل علیحدگی (آکسولیٹ: Isolate) کرنا، معاشرتی مقاطعہ (سیگراگیٹ: Segregate) کرنا، یا پھر انہیں فساد آلود یا گناہ آلود (پروٹ: Pervert) کر دینا ہے۔ تاریخ دان یہ لکھتے ہیں کہ اگر جنگ شہری آبادیوں پر مسلط کر دی جائے تو تاریخ کی پیچیدہ، گھمبیر، لمبی اور خطرناک ترین جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ گولیوں، ٹینکوں اور میزائلوں سے وقتی طور پر سروں کو جھکا یا تو جاسکتا ہے لیکن دل بغاوت کر بیٹھتے ہیں اور دلوں کی بغاوت کہیں زیادہ خطرناک اور طویل ہوتی ہے۔ ایسی اندھی جنگوں (Blind Proxy Wars) میں چند ملکوں کے چند عیار خاندانوں کے تجارتی مفادات پر لاکھوں انسان قربانی کی بھیٹ چڑھ جاتے ہیں۔

اب بھی مشرق وسطیٰ میں جو جنگی منظر نامہ بن رہا ہے اس میں بھی ”پڑوڈالز“ کے حصول کے لیے تیسری دنیا کے سادہ لوح مذہبی جنونیوں کو جنگ میں جھونکا جا رہا ہے۔ ڈالروں کی رسیا فوجیں بھی ایسے معرکے میں پیش ہو سکتی ہیں۔ ایسے محاذوں کے لیے بعض ممالک اپنے اخراجات بچانے کے لیے اپنے قید خانوں کے خواہشمند قیدیوں کو بھی ایسی جنگ کا ایندھن بنا ڈالتے ہیں۔

بنیادی طور پر ایسی جنگوں کے محرکات میں زر (دولت، پٹرول اور دیگر وسائل) یا زمین (قطععات اراضی، خطے اور چھوٹے ممالک) یا نظریاتی اثر و رسوخ اور غلبہ ہوتا ہے۔ اس وقت ان محرکات کے حصول کے لیے روایتی علانیہ جنگ کے علاوہ وقت کی عظیم خفیہ خاموش جنگ جاری ہے۔ اس میں ہر فریق دوسرے فریق کو چیت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ تمام تر نفسیاتی اور ابلاغی حربوں سے اپنی حریف قوموں کو محکوم رکھنے کی پرزور کوششیں جاری ہیں۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر  
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ہمارے خطے کے بارے میں عالمی رویوں میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ ایک بڑی مثبت تبدیلی ہمیں ”انڈوپاک“ کے بجائے ”افپاک“ کہا جانے لگا ہے۔ ورنہ ماضی میں ہمیں غزنوی کے افغانستان کے بجائے ”پرتھوی“ کے ہندوستان (انڈیا) کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا تھا۔

اس شدید نفسیاتی دباؤ کے دور میں ہماری زندگیوں کے مقاصد میں وہ جملہ سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے جسے حضرت ربیع بن عامرؓ نے رستم کے دربار میں ادا کیا تھا۔

”لنخرج العباد من عبادة العباد الى رب العباد“ کہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی غلامی میں دینے آئے ہیں۔

غلامی اور محکوم سے نکلنے کا جو نسخہ پیر مشرق نے تجویز کیا وہی قوم کے لیے اکسیر ہے کہ ایک مثبت تبدیلی کے لیے قوم کے افراد اپنے اندر خودی، فقر اور عشق کے اوصاف پیدا کر لیں۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات  
خودی کی پرورش اور لذت نمود میں ہے  
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو  
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی  
گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو  
تھر تھراتا ہے جہان چار سو و رنگ و بو  
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں  
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو

## راہ نجات

مسجد کو مرکز بنا کر اخلاقی، معاشی اور سماجی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے

دینی قوتیں غور فرمائیں

پاکستان میں بحرانی کیفیت، درپیش شدید مسائل اور ممکنہ حل کے لیے ہم نے سطور سابقہ میں کھل کر بات کی ہے۔ ہمارے لیے اہم ترین بات یہ ہے کہ پاکستان امن وامان سے اس آزمائش کے دور سے گزر جائے اور بالآخر یہاں اسلامی نظام قائم ہو جائے اور احیائے اسلام کا کام شروع ہو جو یقیناً ہر کس و ناکس، مسلمان ہو یا غیر مسلم، حیوانات ہوں کہ نباتات، حتیٰ کہ جمادات سب کے لیے رحمت ہی رحمت ہے۔

ہم یہ بات بھی کہہ ہیں کہ اگرچہ پاکستان کی تخلیق کے پیچھے نعرہ توحید پاکستان کا مطلب کیا..... لا الہ الا اللہ، تھا لیکن اپنے بچپن ہی میں یہ اللہ پرستوں کی بجائے مفاد پرست ٹولہ کے ہاتھ چڑھ گیا۔ اس وقت سے ٹریجڈی یہ ہے کہ اسلام دشمن قوتیں یہ پراپیگنڈا بڑی کامیابی سے کر رہی ہیں کہ اسلامی نظام حکومت کا مطلب مولوی کی وحشت ناک حکومت ہوگا جس میں سختی ہی سختی ہوگی اور یہ آپس میں دنگ فساد کریں گے۔ یوں ملک ہمیشہ فتنہ و فساد کا شکار ہو جائے گا۔ بظاہر فرقہ پسندی کی فضا میں اس بات میں کچھ وزن بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے باوجود کہ اس ملک کے ۹۷ فیصد لوگ مسلمان ہیں اور علماء جمعہ کے بڑے بڑے اجتماعات سے بھی ہفتہ وار خطاب کرتے رہتے ہیں، تبلیغی جماعت بھی لاکھوں لوگوں کے اجتماعات اکٹھے کر لیتی ہے لیکن اسلامی جماعتیں الیکشن میں ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔

جس فیصلہ کن موڑ پر اب پاکستان پہنچ چکا ہے، اگر اسلام پسند چاہتے ہیں کہ یہ ملک قائم رہے اور اسلامی حیثیت سے قائم رہے تو نہایت دانشمندانہ لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اس کے لیے چاہیے کہ پاکستانی سیاسی رہنما، علماء، صوفیاء کرام، افواج پاکستان کے ذمہ داران، ملک کے تجربہ کار دانشور اور ان کے علاوہ

☆ ایٹمی سائنسدان و انجینئر (ستارہ امتیاز) دارالحکمت انٹرنیشنل، ناظم الدین روڈ، F-8/4، اسلام آباد

☆ سلطان بشیر محمود صاحب نے اسلامی تناظر میں پاکستانی معاشرے کے مسائل کے حل کے لیے راہ نجات کے نام سے ایک پمفلٹ لکھا ہے اس کا ایک حصہ جو لائحہ عمل کے عنوان سے ہے، معمولی تہذیب کے بعد یہاں دیا جا رہا ہے۔ مذکورہ پمفلٹ خط لکھ کر ان سے بلا معاوضہ منگوا یا جاسکتا ہے۔

پاکستان کے ہر طبقہ کے چیدہ چیدہ نمائندے خصوصاً اسلام پسند مل کر بیٹھیں اور بیٹھیں رہیں تا وقتیکہ وہ غور و فکر کے بعد بالاتفاق کسی مثبت فیصلہ پر نہ پہنچ جائیں۔

اس ضمن میں، میں کسی دانشمندی کا دعویدار تو نہیں ہوں لیکن ایک فکر مند پاکستانی کی حیثیت سے چند تجاویز آپ کی توجہ کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

۱- احیائے اسلام کی بات ہو یا مسلمانوں کی ترقی کی، میرے نزدیک احیائے مساجد مرکزی نقطہ ہے۔ تاریخ اسلام اس بات کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ پاکستان میں لا الہ الا اللہ کا نظام نہیں آسکا اُس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اسلامی جماعتوں کا مساجد سے جس طرح کا تعلق ہونا چاہیے تھا ایسا نہیں ہوا۔ اصلاح احوال کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہفتہ وار ہر جمعہ کو مسلمانوں کے اجتماعات کا بندوبست کیا ہے لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔

افسوس یہ ہے کہ مساجد اتحاد کا منبع ہونے کی بجائے مسلمانوں کی باہمی تقسیم کا باعث بنا دی گئی ہیں حتیٰ کہ مساجد کے نام اور اُن کی پہچان مختلف فرقوں کے اعتبار سے ہوتی ہے یعنی مسجد اہل حدیث، مسجد اہل سنت وغیرہ وغیرہ۔ اگر اسلام پسند لوگ واقعی اپنی پسند میں مخلص ہیں تو پہلا قدم مسجدوں کو فرقہ بندی سے پاک کرنے کا ہوگا۔ یہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں اس لیے ان کے نام بدل کر اسماء الحسنیٰ جل جلالہ پر رکھے جائیں۔ مثلاً مسجد الرحمن، مسجد الرحیم، مسجد الصبور، مسجد العلم وغیرہ وغیرہ تاکہ مسجد سے فرقہ بندی کی بُن نہ آئے۔

۲- احیائے مساجد کے لیے مسجد کے امام صاحب کے مقام کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جب تک امام مسجد کو امام (لیڈر، رہنما) کی سی عزت نہیں ملتی، احیائے مساجد اور احیائے اسلام ناممکن ہے۔ اسی لیے بے دین طبقہ نے مولوی صاحب کے متعلق ایک ظالمانہ غلط تصور پیدا کیا ہے جس نے امام مسجد کی عزت اور اہمیت کو ختم کر دیا۔ ان غلط اثرات کو دور کرنا بہت ضروری ہے اور اس پر فوری عمل ہونا چاہیے کیونکہ امام مسجد اسلام کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ اپنے معاشرہ میں دین کا لیڈر ہے۔ اُسے اپنے علاقہ کا لیڈر بھی ہونا چاہیے۔ اسلام کے دعویداروں کو چاہیے کہ اُن کے بارے میں محبت، خلوص، پیار، عاجزی کی بجائے جو سختی، ضدی اور جاہل ہونے کا تصور پیدا کیا گیا ہے اُسے عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ وہ غلط ہے۔ یہ مذموم پراپیگنڈا اسلام دشمن لوگوں کا پیدا کردہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ امام مسجد خود خدمت کا پیکر بن کر لوگوں کے سامنے آئیں اور اپنے خطبات میں اُن مسائل کی بات کریں جن کی وجہ سے عوام پریشان ہیں، تاکہ وہ اور عوام ایک ہی سوچ کے ہو جائیں۔

۳- پرائمری تعلیم کا نظام مساجد میں لایا جائے۔ علماء اور مساجد کی انتظامی کمیٹیوں کو چاہیے کہ ہر مسجد میں فجر کی نماز سے ظہر کی نماز تک پرائمری سکول کھول دیا جائے تاکہ پاکستان کا کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہے اور پاکستانی نونہال اپنے بچپن ہی سے مسجد کی فضاء میں تربیت پائیں۔

۴- پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کو عملاً نافذ کرنے کے لیے جہاں جہاں آئین میں تبدیلی کی ضرورت ہے، اتفاق رائے سے اُس کی اصلاح کی جائے۔ اگلے الیکشن میں یہ بنیادی ایشو ہونا چاہیے۔ اس کے لیے علماء حضرات مساجد سے اور نوجوان کالجوں سے آواز اٹھا کر عوام کو قائل کریں۔

۵- عوام مہنگائی اور حکمرانوں کی شاہ خرچیوں سے تنگ ہیں۔ اسی طرح امن و امان اُن کی ضرورت ہے۔ انہیں روزگار چاہیے اور تھانہ کلچر سے نجات چاہیے۔ غرض عوام کے بے شمار مسائل ہیں جن کی حمایت میں جمعہ کے خطبات میں بات ہونی چاہیے اور مساجد سے رہنمائی ملنا چاہیے تاکہ عوام کو احساس ہو کہ مسجدوں میں جو بیٹھے ہیں انہیں نہ صرف ہماری آخرت کی فکر ہے بلکہ ہمارے دنیاوی مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی وہ بیتاب ہیں۔

۶- پاکستان کے اندر کسی بیرونی مداخلت کو برداشت نہ کیا جائے۔ مسلمان ممالک کے ساتھ گہرے برادرانہ تعلقات استوار کرنے کی بھرپور کوششیں کی جائیں۔ مسلمان ممالک کو پاکستان میں انویسٹمنٹ کے لیے تیار کیا جائے۔ پاکستانی شہریت کو حاصل کرنا غیر پاکستانی مسلمانوں کے لیے آسان بنایا جائے۔

۷- جہاں تک معاشی بحران کا تعلق ہے ہم بتا چکے ہیں کہ اس کا واحد حل 'میڈان پاکستان' (Made in Pakistan) میں ہے، مساجد سے خود انحصاری کے حق میں آواز اٹھنا چاہیے کہ صرف پاکستان کی بنی ہوئی چیزوں کا استعمال کیا جائے اور غیر ملکی مصنوعات کا مکملہ حد تک بائیکاٹ کیا جائے تاکہ پاکستان کی انڈسٹری کا پیہ چل نکلے اور غریب مزدوروں کو دوبارہ روزگار مل جائے۔

۸- پاکستان کے معاشی حالات کو بدلنے کے لیے پاکستان کا بجٹ بیرونی قرضوں اور غیر ملکی امداد کی بجائے خود انحصاری کی بناء پر بنایا جائے۔ حکمرانوں کی شاہ خرچیوں کو پورا کرنے کے لیے بجٹ میں بے حساب دولت رکھی جاتی ہے اور عوام کو صرف ۱۵-۱۶ فیصد مزید مہنگائی کی نوید سنائی جاتی ہے۔ ایسے بجٹوں کو رد کر دیا جائے اور اُن کے خلاف مساجد سے احتجاج کیے جائیں اور ایسے بجٹ کا مطالبہ کیا جائے جس میں پاکستان کے غریب عوام کے مسائل کا فوری حل ہو اور روزگار کو بھی یقیناً



بنایا جائے۔

۹- یکے بعد دیگرے پاکستانی حکومتیں دھڑا دھڑا قرضے لے رہی ہیں۔ انہوں نے مستقبل میں پیدا ہونے والے ہمارے بچوں کو بھی بے حساب مقروض کر دیا ہے۔ اس مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام پسندوں کو چاہیے کہ وہ قرض لینے کی پالیسی کو رد کریں۔ سودی نظام، غیر ملکی قرضے اور امداد کو جو کہ ایک بہت بڑا دھوکہ اور فراڈ ہیں، اُن کے خلاف بھرپور احتجاج کریں اور عملی خود انحصاری کے لیے حکومت، عوام اور صنعت کاروں کو مجبور کریں۔

۱۰- سودی نظام کے خلاف اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی جاری جنگ کا ساتھ دیں۔ بنکوں کا نظام بطور امانت دار صحیح اسلامی رُوح کے مطابق تبدیل کیا جائے۔ مساجد میں باہمی معاشی اور انتظامی امداد کی سرپرستی کے لیے کمیٹیاں بنائی جائیں تاکہ روزگار کے مواقع پیدا ہوں۔

۱۱- اسلام پسند عوام اس مطالبہ کے حق میں بھی سخت احتجاج کریں کہ وہ سیاسی اور غیر سیاسی لوگ جنہوں نے اپنے اکاؤنٹ باہر کے ممالک میں رکھے ہیں وہ اپنا پیسہ اپنے ملک میں واپس لائیں ورنہ اس سرزمین کو چھوڑ کو وہاں چلے جائیں جہاں انہوں نے اپنی دولت چھپائی ہے۔

۱۲- وہ لوگ جن کے بیرونی ممالک میں اکاؤنٹ، کوٹھیاں، محلات اور جائیدادیں ہیں اور یہ بھی کہ پاکستان کے علاوہ جن کے پاس پاکستانی شہریت کے ساتھ کسی دوسرے ممالک کی شہریت بھی ہو انہیں پاکستان میں کسی سرکاری عہدہ اور کسی عوامی اسمبلی کے لیے الیکشن لڑنے کی اجازت نہیں ہونا چاہیے۔

۱۳- پاکستان میں اکثر جاگیرداروں، سجادہ نشینوں اور نوابزادوں کا کردار غریب کو غریب تر اور جاہل رکھنے کا رہا ہے۔ انہیں جاگیریں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دینے کی وجہ سے ملی تھیں۔ غداروں سے لی گئی یہ جائیدادیں بحق عوام ضبط ہو جانی چاہئیں۔ اسلام پسندوں کو چاہیے کہ اس مسئلہ کو عوامی اور حکومتی عدالتوں میں لے کر جائیں تاکہ حقداروں کا حق اُن تک پہنچ جائے۔

۱۴- قرآن کریم میں بار بار مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ مشرکین، یہودی، عیسائی اور اسلام دشمنوں سے دوستی نہ کریں۔ اُن سے دنیاوی کام چلانے کے لیے معاہدے تو ہو سکتے ہیں لیکن غیر مسلموں کے اوپر انحصار اور اُن سے دوستانہ مراسم بڑھانے کے لیے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ ہمیں اجازت نہیں دیتے۔ ہماری دوستی اور برادرانہ تعلق انفرادی سطح پر ہو یا ملکی سطح پر، مسلمانوں سے ہی حلال ہے۔ مساجد سے چاہیے کہ غیر مسلم طاقتوں سے دوستی کا دعویٰ اور اُن کی ناز برادریاں

اٹھانے کے خلاف احتجاج ہوتا رہے۔ مسلم اُمہ کا تصور اُجاگر کرنے کے لیے اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات شروع کیے جائیں۔ پاکستانی یونیورسٹیوں میں مسلم ممالک کے طلباء کو فری داغیے دیے جائیں۔ صوبوں کی سطح پر غریب طلباء کے لیے تعلیمی وظائف دینے کا سلسلہ شروع ہوتا کہ جو پڑھنے کے لائق ہے اُسے ضرور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے۔

۱۵- سادگی کے حق میں اور فضول خرچی کے خلاف بولا جائے اور حکومتی اداروں کو شاہ خرچیوں سے روکنے کے لیے احتجاجی کوششیں جاری رہیں۔ دفتروں میں ایئر کنڈیشن کے استعمال کو کم سے کم کیا جائے۔ فضول دوروں پر، خواہ وہ صدر کے ہوں یا وزیراعظم کے، پابندی ہونی چاہیے۔

۱۶- تاجروں، صنعت کاروں، زمینداروں اور افسران حکومت سے اپیل کی جائے اور انہیں قائل کیا جائے کہ ملک بچانے کے لیے اپنی آمدنی کا کم از کم ۲۰ فیصد، ۷ سال کے لیے بلا سود پاکستان کو قرض دیں تاکہ عوامی مسائل کو حل کرنے کے لیے رقم فراہم ہو۔

۱۷- بینکوں میں لوگوں کا جو سونا، چاندی جمع ہے وہ پاکستان کو دس سالوں کے لیے قرض دیا جائے تاکہ غیر ملکی قرضوں سے نجات حاصل کی جائے۔

۱۸- ملک کی پیداوار بڑھانے کے لیے ہر محنت کار کو اپیل کی جائے اور قائل کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک گھنٹہ اپنے ملک کی خاطر زیادہ کام کرے۔

۱۹- پاکستان میں بڑی بڑی کوٹھیاں اور محل بنانے کا جو رواج چل پڑا ہے۔ اُس پر پابندی لگائی جائے اور ایک کنال (۲۰ مرلہ) سے زیادہ کا کوئی رہائشی پلاٹ نہ بنایا جائے۔

۲۰- اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں کا معیار بڑھایا جائے تاکہ ہر یونیورسٹی مرکز تحقیق بھی ہو۔

۲۱- تمام منصوبوں میں خود انحصاری کی پالیسی کو بنیادی اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔

یہ چند گزارشات اور تجاویز ہیں جو میں اپنے علماء اور دانشوروں کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ وہ کوئی عملی جدوجہد شروع کریں۔ خالی خولی بات چیت بہت ہو چکی۔ پاکستان کے پاس لفاظی اور تبصروں کا وقت نہیں رہا۔ تاریخِ عالم میں جب بھی مسلمانوں پر کوئی بُرا وقت آیا تو اسلام نے آگے بڑھ کر انہیں گرنے سے بچا لیا۔ ان شاء اللہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام ہمیں بچائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب پاکستانی اپنی غلطیوں کی طرف توجہ کریں گے اور راہِ راست پر آنے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی مدد کے لیے اپنے فرشتے بھیجے گا۔ آئیے، اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے عملی طور پر فتنہ و فساد روکنے کے لیے آواز بلند کریں بلکہ اپنی قوت کا بھی مظاہرہ کریں تاکہ دشمنوں کے دلوں پر آپ کا زعب پڑ جائے۔

## احیائے مساجد اور روحانی خلافت کے متعلق اقدامات

مُسلم اُمّہ کا وجود زمین پر مسجد سے لازم و ملزوم ہے جس کا آئیڈیل رسول اکرم ﷺ کے زمانے اور خلافت راشدہ کے دور میں مسجد نبوی تھی۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی اور روحانی طاقت کا سرچشمہ تھی اور یوں پوری اُمت کا دارالخلافہ تھی۔ اسی نمونہ پر صوبوں کے صدر مقامات کی مسجدیں تھیں۔ یوں اپنی اپنی سطح پر ہر ایک مسجد خلافت کے نظام کی قائم مقام تھی لیکن دھیرے دھیرے مساجد کی یہ پہچان اور شانِ قصرِ صدارت میں منتقل ہو گئی۔ مساجد کا نظام کمزور ہوتا گیا اور نتیجتاً اسلام کی قوت بھی کمزور ہوتی گئی۔ بالآخر دوسرے مذاہب کے پوجا پاٹ کے گھروں کی طرح ہماری مسجدیں بھی فرقہ بازی کی بنیاد پر محض عبادت خانے بن کر رہ گئیں اور اب زیادہ تر مسلمانوں کے اتحاد کی بجائے باہمی تفریق کی جگہیں ہیں۔ اگر ہم اسلام کی نشاۃ ثانیہ چاہتے ہیں تو مسلم معاشروں میں مساجد کو نبی پاک ﷺ کی مسجد کے نمونہ کو سامنے رکھ کر مرکزی کردار واپس دلانا ہوگا۔

کچھ لوگ مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں کہ علماء میں فرقہ بازی کی وجہ سے شاید یہ تجویز کامیاب نہ ہو، لیکن ان کی یہ مایوسی اس کے اسلامی پہلوؤں سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ اس میں سنت نبوی ﷺ کا احیاء ہے اور کوئی بھی فرقہ سنت کے خلاف نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی کامیابی میں امام مسجد اور مسجد کمیٹیوں کی عزت ہے۔ لوگ بھی جب معاشرتی زندگی میں مساجد کے بڑھتے ہوئے فوائد کو دیکھیں گے تو اس کی حمایت کریں گے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ اگر یہ تجربہ چند ایک مساجد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو بات خود بخود آگے بڑھنے لگے گی۔

اس لیے اسلام کے احیاء کی طرف پہلے عملی قدم کے طور پر مسجد کے احیاء پر کام شروع ہونا چاہیے۔ کچھ نہیں تو ہر مسجد کی مجلس شوریٰ (مسجد کمیٹی) کے زیر انتظام مندرجہ ذیل اقدامات تو ضروری ہیں تاکہ یہاں سے نکلنے والے نور سے شہر کے سب گھر منور ہو جائیں اور مسجد مسلمانوں کی سماجی، معاشرتی اور معاشی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرے۔

۱۔ نظامِ صلوٰۃ کا قیام: مساجد میں پنجگانہ زندہ نماز قائم کی جائے جیسے نماز قائم کرنے کا حق ہے۔ تعلیم بالغاں کا انتظام ہو جہاں لوگ قرآن کریم، احادیث، سیرت طیبہ، اسلامی تاریخ اور دنیا پر اسلام کی برکات کے متعلق تعلیم سیکھیں۔ نمازی نماز کی اصل روح سے آشنا ہوں اور مسجد سے حاصل کردہ نور کا خزانہ اپنے گھروں کو بھی پہنچائیں تاکہ صلوٰۃ کے نتیجہ میں معاشرہ بری باتوں اور فواحش سے پاک ہو جائے۔

۲۔ نظامِ زکوٰۃ کا قیام: ہر مسجد میں بیت المال کھولا جانا چاہیے جہاں لوگ اپنی زکوٰۃ، صدقات اور امانتیں جمع کرائیں جو اسلامی حکم کے مطابق تقسیم ہوں، تاکہ حق داروں تک اُن کا حق پہنچ جائے اور

مساکین، فقراء اور یتامیٰ کو مناسب مدد دی جاسکے۔

۳- ابتدائی تعلیم کے نظام کا قیام: ہر مسجد میں قرآن کریم اور اسلام کی دیگر تعلیمات کے علاوہ حکومتی نصاب کے مطابق مسجد کی مجلس شوریٰ کے زیر انتظام اعلیٰ معیاری پرائمری تعلیم کے لیے مکتب کھولے جائیں تاکہ کوئی بچہ پڑھنے لکھنے سے محروم نہ رہ جائے۔ اس طرح بچے اپنے بچپن ہی سے مسجد سے جو جائیں گے اور وہ پرائمری سکول کی تعلیم ختم ہونے تک قرآن کریم اور اسلام کے ضروری مسائل اور اعمال سیکھ چکے ہوں۔

۴- بنیادی نظام عدل کا قیام: لوگ اپنے باہمی جھگڑے اور دیگر مسائل مسجد کی مجلس شوریٰ کے پاس لے کر آئیں اور مسجد کے اسلامی ماحول میں اپنے اختلافات اور معاملات حل کریں یعنی مسجد علاقہ کی پنچایت گھر بھی ہو جہاں مظلوم کی دادی ہو سکے۔

۵- حفظانِ صحت کے نظام کا قیام: ہر مسجد میں روحانی علاج کے علاوہ اسلامی طب کے مطابق جسمانی علاج کا انتظام بھی ہو۔ لوگوں کے علاج معالجہ کے لیے ڈسپنسریاں کھولی جائیں جہاں غریبوں کا ۲۴ گھنٹے مفت علاج ہو۔ بہتر ہوگا اسلام کے درخشندہ ماضی کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے علماء اسلامی طب کے بھی ماہر ہوں تو وہ خود نمازوں کے اوقات کے علاوہ مسجد سے ملحقہ مطب کھول کر دین و دنیا کی مزید خدمت کر سکتے ہیں۔

۶- اصلاحِ معاشرہ کے نظام کا قیام: اسلامی فقہ میں لوگوں کی رہنمائی کی جائے اور اصلاح کی غرض سے عملی طور پر حکمت سے معاشرہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے کوششیں کی جائیں۔

۷- نظامِ معاش کا قیام: مسجد سے بے روزگاروں کو قرضِ حسنہ دیئے جائیں۔ قرضِ حسنہ کے لیے لوگوں کے پاس فالتو پیسے ہوں گے جو وہ بطور امانت اسی مقصد کے لیے مجلس شوریٰ کے پاس جمع کرائیں۔ اگر کسی مسجد کا مدرسہ ہو تو مسجد کمیٹی کے زیر انتظام حلال اور حرام، پاک اور ناپاک کی تمیز کرتے ہوئے خوراک کے شعبہ کے متعلق کاروبار کیا جانا چاہیے۔ مثلاً بیکری، تاکہ معاشرہ کو وہاں سے پاکیزہ خوراک ملے اور مسجد کی اپنی بھی کچھ آمدنی ہو۔ مزید یہ کہ مدرسہ کے طلباء وہاں سے عملی کاروبار کرنے کی ٹریننگ بھی حاصل کر سکیں۔

۸- خواتین کی مساجد میں حاضری: جیسے خاتم النبیین، رحمت اللعالمین ﷺ کی مسجد میں پنجگانہ نماز میں مسلم خواتین حصہ لیتی تھیں، آج بھی خواتین اور بچوں کو مسجدوں میں واپس لانے کے لیے

تلقین کی جائے تاکہ سارے کے سارے مسلم معاشرہ کا مسجد سے مضبوط تعلق قائم ہو جائے۔

مندرجہ بالا اقدامات سے مساجد معاشرہ کی زندگی میں ایک با اثر مرکزی مقام حاصل کر لیں گی، اس سے امام صاحب اور مسجد کمیٹیوں کے ارکان کو بھی وہ عزت ملے گی جس کے وہ حقدار ہیں لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُمہ کی سطح پر اسلامی نظام خلافت قائم کرنے کی ابتداء ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے اس نظام کے پھیلنے اور مضبوط ہونے میں کچھ وقت لگ جائے لیکن اس کے مقامی طور پر جو فوائد ہیں ان سے معاشرہ فوری فیض یاب ہونے لگے گا۔

میں برسوں کے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موجودہ حالات میں اگر آپ مسلم اُمہ میں خلافت کا احیاء چاہتے ہیں تو اس کی بنیادی اینٹ مسجد ہی ہو سکتی ہے۔ جب یہ بنیادی اینٹیں باہم لگنا شروع ہوں گی تو روحانی خلافت کی عمارت کھڑی ہونے لگے گی۔ روحانی خلافت کے نظریہ سے میں سیاسی خلافت کی نفی نہیں کر رہا ہوں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ حالات میں نسبتاً آسانی سے کون سا کام ہو سکتا ہے اور یوں درجہ بدرجہ اپنی کھوئی ہوئی منزل کو کیسے پایا جاسکتا ہے؟ اُس کے لیے بغیر کسی بڑی چپقلش کے سیدھا طریقہ بھی نظر آتا ہے۔

اس نظام میں اپنی اپنی جگہ پر ہر مسجد ایک مئی خلافت گاہ ہوگی۔ یوں جیسے جیسے مساجد میں خلافت کا بنیادی نظام قائم ہوتا جائے گا اور وہ آپس میں منسلک ہوتی جائیں گی اور دھیرے دھیرے یہ اپنی مجموعی شکل میں بھی نظر آنے لگے گا۔ محلہ جاتی مسجدوں کے تعاون سے پورے شہر میں روحانی خلافت کا مرکز سب سے بڑی جامع مسجد ہوگی۔ اسی طرح یہ سلسلہ بڑھتے ہوئے ضلع، صوبہ، ملک اور پوری دنیا میں پھیل سکتا ہے۔ ان شاء اللہ۔ پھر مسلمانوں کا دنیا بھر میں ایک روحانی خلیفہ ہوگا جو مساجد کی عالمی تنظیم کا سربراہ ہوگا اور یوں مسلمانوں کا روحانی رہنما ہوگا۔ مساجد کا یہ عالمی الحاق مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی علامت، اسلام کی عالمی تبلیغ اور مسلم اقلیتوں کے حقوق کے دفاع میں اہم کردار کر سکے گا۔

معزز قارئین! مندرجہ بالا تجاویز مسائل سے خالی نہیں لیکن ایسا کون سا منصوبہ ہے جس میں کوئی مسئلہ نہ ہو؟ ان شاء اللہ! نیت صاف ہو تو ہر مسئلہ کا حل بھی نکل آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں کچھ علماء اپنی مخصوص وجوہات کی وجہ سے مسجد کو خلافت کی پہلی منزل بنانے سے متفق نہ ہوں لیکن مجھے اُمید ہے کہ جب وہ غور فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ اُن کی اپنی عزت اور بقاء بھی اس مجوزہ نظام سے بہتر کسی اور نظام میں نہیں۔ ابتداء میں مشکلات ضرور پیش آئیں گی لیکن اگر آپ ایک مسجد میں یہ تجربہ کامیاب کر لیتے ہیں تو اس کے فوائد دیکھتے ہوئے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔ آپ سے فاسبقوا الخیرات نیکی میں جلدی کرو کی درخواست ہے۔

## تزکیہ نفس میں قرآن حکیم کا کردار

۱- اسلام آباد سے ہمیں زاہد اقبال صاحب نے لکھا ہے کہ ”میں خالق تک پہنچنا چاہتا ہوں..... لیکن جب میں کسی ’شیخ‘ کی کتاب پڑھنے لگتا ہوں تو وہ شیخ میرے اور میرے رب کے درمیان ’حائل‘ ہو جاتا ہے..... میری ذات کے لیے قرآن کا تذکرہ، تدبر اور تفکر کیوں کافی نہیں؟“

۲- زاہد اقبال صاحب کی بات فکر انگیز ہے اور اس میں وزن بھی ہے تاہم اس کے بعض پہلو کمزور بھی ہیں اور فکری کنفیوژن پر مبنی بھی۔ ہم اختصار کے ساتھ ان کی اور ان جیسی فکر رکھنے والے دیگر احباب کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنا چاہیں گے:

۳- قرآن اللہ کا کلام ہے اور ہم انسانوں کے لیے اللہ کی برہان اور فرقان ہے۔ وہ ہماری ہدایت کا منبع اور ہمارے دین کا بنیادی ترین ماخذ ہے۔ اس کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہم جتنے الفاظ بھی استعمال کریں وہ کم ہیں اور جتنا مبالغہ بھی اس میں کریں وہ جائز ہے اور قرآن اس سے زیادہ کا مستحق ہے..... تاہم یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ خود اللہ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ کافی نہیں سمجھا کہ ان کو ایک کتاب بھجوا دی جائے بلکہ وہ ایک پیغمبر بھجواتا ہے اور اسے ایک ماڈل بنا کر کھڑا کرتا ہے۔ اللہ اسے کتاب بھی عطا فرماتا ہے اور اس کے علاوہ بھی حسب ضرورت اور ہر چھوٹے بڑے مسئلے میں اس کی اعانت کے لیے اس کی رہنمائی فرماتا ہے۔ گویا سنت رسول اللہ ﷺ اور اسوۂ رسول اللہ ﷺ بھی قرآن حکیم کے ساتھ انسانوں کی ہدایت کے اس پہنچ کا لازمی حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے طے فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں لوگوں میں یہ تبدیلی لانے کے لیے کہ وہ اپنی زندگی اللہ کی رضا کے مطابق گزاریں اپنے پیغمبروں کو اور خصوصاً آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو یہ طریق کار بتایا ہے کہ وہ قرآن حکیم اور حکمت کی تعلیم کے ذریعے ان کے نفوس کا ایسا تزکیہ و تربیت کریں کہ ان کے لیے یہ کار عبودیت آسان ہو جائے۔

اس مختصر وضاحت سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوں گی:

i- دین میں اصل چیز تزکیہ نفس ہے یعنی نفس انسانی کی ایسی عملی تربیت کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے عبودیت کی زندگی گزار سکے۔

ii- اس کے لیے ایک مڑکی و مربی (پیغمبر) کی ضرورت۔

## iii- پیغمبر لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے تعلیم قرآن و حکمت کے ذریعے۔

۴- پیغمبر کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب ہمارے تزکیے کے لیے قرآن و سنت کافی ہیں یعنی اب مسلم شخصیت کا تزکیہ ہوگا تعلیم قرآن و حکمت کے ذریعے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی سنت اور اسوہ حسنہ ہے (اسوہ بھی قانونی لحاظ سے سنت رسول ہی کا ایک حصہ ہے لہذا عموماً اس کے لیے 'سنت' کا لفظ ہی کافی سمجھا جاتا ہے)۔

اگر انسان سلیم الفطرت ہو تو وہ آسانی سے قرآن و سنت سے استفادہ کر کے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیتا ہے اور یہ ہو جاتا ہے تاہم اگر نفس انسانی مریض ہو تو اسے ڈاکٹر حکیم ربی مزکی کی ضرورت پڑے گی۔ اس بات کو روزمرہ زندگی کی ایک عام فہم مثال سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک آدمی کا معدہ اگر ٹھیک ہو تو وہ جو اچھی غذا بھی کھائے گا وہ اس کے جزو بدن بنے گی اور وہ صحت مندر ہے گا لیکن اگر اس کا معدہ خراب ہو تو اسے دودھ اور مکھن دن رات بھی کھلائیں گے تو فائدہ نہ ہوگا بلکہ مزید نقصان کا خدشہ ہے جب تک وہ ڈاکٹر حکیم کے پاس جا کر اپنے معدے کا علاج نہ کرائے۔ گویا جسمانی طور پر صحت مندر رہنے کے لیے صرف غذا کا صحیح ہونا کافی نہیں بلکہ معدے کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح قرآن و سنت کی تعلیمات انسان کی ایمانی صحت کے لیے کافی و شافی ہیں لیکن اگر نفس مریض ہو تو وہ اس صالح غذا سے استفادہ نہیں کر پاتا اور اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ کسی ایسے حکیم ربی مزکی سے علاج کرائے جو اس کے نفس کا علاج کرنے کی صلاحیت، مہارت اور تجربہ رکھتا ہو۔ اس ربی مزکی کا کام یہ ہے کہ وہ سالک راہ حق کے نفس کا علاج کر کے اسے اعتدال پر لے آئے تاکہ وہ قرآن و سنت کی حیات بخش تعلیمات پر عمل کر کے دنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکے۔

اب سالک راہ حق اگر صحیح ربی مزکی تک پہنچا ہے تو وہ اس کا علاج کر کے اسے قرآن و سنت پر ہی لائے گا اللہ یہ کہ وہ کوئی نا اہل عطائی ہو جو اس کے دین و ایمان کا بیڑہ غرق کرے اور اس کے اور اس کے رب کے درمیان حائل ہو لہذا ایک طالب تزکیہ کے لیے اول تو قرآن و سنت پر عمل کافی ہونا چاہیے لیکن اگر وہ محسوس کرے کہ وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود معصیت سے بچ نہیں پارہا یا احکام شریعت پر عمل کے مثبت اثرات سے محروم ہے تو اسے کسی ایسے ماہر فن سے رجوع کرنے میں کوئی مانع نہیں ہونا چاہیے جو دین پر چلنے میں اس کی مدد کرے۔ ایسا شخص یا اس کی کوئی تحریر اس کے اور اس کے رب کے درمیان حجاب کیسے بن سکتی ہے؟ اس ربی کی تو کوشش ہی یہ ہوتی ہے، ہدف ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کا سچا عبد بن جائے۔

۵۔ مسلمانوں میں ایک ادارہ بتدریج وجود میں آیا تھا، جس کا نام تصوف پڑ گیا۔ اس کے پیش نظر یہ تھا کہ لوگوں کو ان کے تزکیہ نفس میں مدد دے۔ ہمارے متقدمین میں سے جو لوگ مزی و مربی تھے وہ دین کے بارسوخ عالم ہوتے تھے، محدث و فقیہ ہوتے تھے، مدرسہ عموماً زاویے اور رباط کا ایک حصہ ہوتا تھا اور ایسی متوازن شخصیت کی نشوونما ہر مربی و مزی کا ہدف ہوتی تھی جو قرآن و سنت کو مطلوب ہے اور جس کا بہترین نمونہ حضور اکرم ﷺ کی ذات ستودہ صفات ہے۔

پھر جب مسلم معاشرہ زوال پذیر ہوا تو دوسرے افراد اور اداروں کی طرح تصوف اور اہل تصوف بھی زوال کی اس لہر سے نہ بچ سکے اور بے شمار ایسی رسوم و رواج اور افکار و نظریات ان میں در آئے جو قرآن و سنت کے معیار پر پورے نہ اترتے تھے یا اس کے خلاف تھے بلکہ بعض مسلمان مفکرین تو اس دور متاخرین کے تصوف کو خود سبب زوال سمجھتے ہیں۔ اس انحراف و زوال کی ایک علامت یہ ہے کہ قرآن و سنت ذریعہ تزکیہ اور ہدف تزکیہ نہ رہے۔

۶۔ عہد رسالت مآب ﷺ میں دیکھیے تو قرآن ہی ذریعہ تزکیہ تھا، قرآن ہی مرکز نصاب تھا۔ صحابہ کا اکثر وقت قرآن پڑھنے پڑھانے میں گزرتا تھا۔ وہ لوگ عربی دان تھے قرآن سمجھ کر پڑھتے تھے اور ان کے قرآن پڑھنے کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ قرآن پڑھنے سے ان کا دل پگھلتا اور آنکھیں برستی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ کتنے دن میں قرآن ختم کرتے ہو؟

آج ہماری حالت یہ ہے کہ قرآن کا ہماری زندگیوں میں کوئی عمل دخل نہیں۔ جدید تعلیم مغرب زدہ ہے۔ وہاں قرآن کا کیا کام؟ کتاب دینیات کی چند آیات و احادیث اس نصاب اور نظام تعلیم کا حصہ ہیں جو سارے کا سارا غیر اسلام پر مبنی ہے۔ حد یہ ہے کہ دینی مدارس میں بھی عربی، حدیث اور فقہ کا حصہ قرآن سے زیادہ ہے۔ آج کل کے صوفیوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ نہ انہیں خود قرآن سے شغف و آگاہی ہے اور نہ ان کے ہاں قرآن کی تعلیم و تدریس، تلاوت و فہم اور اس کی آیات پر تفقہ و تدبر کا کوئی سلسلہ ہوتا ہے۔

ہماری طالب علمانہ رائے میں ہمارے معاشرے میں حصول قرآن حکیم سے تزکیہ کا لائحہ عمل یہ ہونا چاہیے:

۱۔ تلاوت قرآن (خواہ اس کا مفہوم نہ سمجھ آ رہا ہو) روزانہ حسب توفیق۔ کوشش زیادہ سے زیادہ کی ہونی چاہیے، یہ سوچ کر کہ یہ اللہ کی کتاب ہے جو گویا مجھ پر نازل کی گئی ہے، جو مجھے مخاطب کرتی ہے، جو میرے لیے ہے۔ جس میں میرا ذکر ہے..... اس سے تلاوت میں تاثیر پیدا ہوگی۔



۲- جو عالم نہیں ہیں اور جنہیں عربی نہیں آتی انہیں چاہیے کہ قرآنی عربی سیکھیں (کسی عالم سے، کتاب سے یا نیٹ سے) اور روزانہ قرآن حکیم کا کچھ حصہ ترجمے سے پڑھیں تاکہ انہیں قرآن کا فہم حاصل ہو سکے۔

۳- قرآنی عربی سیکھنے اور ترجمہ قرآن کے ذریعے فہم قرآن کے حصول کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک کہ فہم قرآن کی منزل سر نہ ہو جائے۔ اس کا ایک سادہ معیار یہ ہے کہ امام صاحب جب قرأت کریں تو آپ کو اس کا مفہوم سمجھ آ رہا ہو کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں اور قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

۵- اس سے اگلی منزل قرآن پر تدبر و تفکر کی ہے۔ اس کی آیات پر مراقبے کی اور اس سے تاثیر جذب کرنے کی ہے۔

۶- جسے قرآن یاد نہ ہو اسے چاہیے کہ قرآن حفظ کرے۔ سارا قرآن یاد کرنا اور رکھنا تو نعمت عظمیٰ ہے لیکن قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ تو ہر مسلمان کو یاد ہونا چاہیے کہ وہ دل مردہ ہے جس میں قرآن نہ ہو۔

۷- قرآن پڑھنے، سیکھنے، سمجھنے سے اصل نیت اس پر عمل کی ہونی چاہیے۔ لہذا جب اس کا فہم حاصل ہو جائے تو جہاں قرآن کسی کام کے کرنے کا حکم دے وہاں رک کر سوچنا چاہیے کہ کیا میں اس حکم پر عمل کر رہا ہوں اور جہاں قرآن کسی کام سے منع کرے وہاں رک کر سوچنا چاہیے کہ کیا میں اس سے رک گیا ہوں۔ جہاں اللہ کے عذاب کا ذکر ہو وہاں اس سے پناہ مانگنی چاہیے اور جہاں اس کی نعمتوں کا تذکرہ ہو وہاں ان کے حصول کی دعاء کرنی چاہیے۔ اس طرح قرآن آپ کا حال بن سکتا ہے۔

۸- قرآن دوسروں کو سکھایا جائے، اس کی دعوت دوسروں تک پہنچائی جائے۔ اپنے گھر سے لے کر گلی محلے تک، شہر سے لے کر صوبے اور ملک تک اور مسلمانوں سے لے کر غیر مسلموں تک۔ غرض یہ کہ قرآن ہمارا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہیے۔ یہ ہمارا دن رات کا موضوع ہونا چاہیے۔ یہ ہر گھر کی ٹیبل ٹاک ہونا چاہیے لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم سارے کام کرتے ہیں، قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا کام نہیں کرتے۔ حالت یہ ہے کہ ہمارے علماء اور قراء حضرات مسجدوں میں اور لوگوں کے گھروں میں بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں لیکن محض ناظرہ۔ ہمارے ایک عزیز جو اسلامیات کے پروفیسر اور صالح آدمی ہیں، محلے کے نمازیوں کے اصرار پر ایک دفعہ تبلیغی جماعت کے ساتھ گئے۔ وہاں جب گشت پر لوگوں سے ملاقات کے لیے نکلے تو انہوں نے اکثر جگہ مدعوین کو قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی طرف توجہ دلائی۔ تبلیغی بھائیوں نے واپس آ کر اپنی جماعت کے امیر سے شکایت لگائی کہ یہ پروفیسر صاحب جہاں گئے لوگوں کو قرآن پڑھنے کا کہتے رہے جماعت کی طرف دعوت دی ہی نہیں۔ اللہ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔

۶- زاہد اقبال صاحب نے لکھا ہے کہ میں خالق تک ”پہنچنا“ چاہتا ہوں۔ عربی میں اسے ’وصول الی اللہ‘ کہتے ہیں۔ متقدمین صوفیاء میں سے کسی نے اگر یہ اصطلاح استعمال کی تو اس کا مطلب تھا کمال عبودیت۔ آدمی اگر اللہ کی معصیت سے بچ گیا تو سمجھیے اس کا تزکیہ ہو گیا اور اگر وہ غفلت سے بھی بچ گیا تو سمجھیے اعلیٰ درجے کا مسلمان بننے کی راہ ہموار ہو گئی۔ یہی وہ عبودیت (بندگی) ہے جس کے لیے اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے یعنی اللہ کی پرستش اور اطاعت، اور کمال یہ ہے کہ یہ درجہ احسان کی ہو۔ بعد میں آنے والوں نے وصول الی اللہ کے مفہوم میں حلول وغیرہ جیسی غیر شرعی چیزیں داخل کر دیں جو ظاہر ہے ناقابل قبول ہیں۔

اصطلاحات کے بارے میں نکتے کی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اولیٰ اور محفوظ بات یہ ہے کہ قرآن و سنت کی اصطلاحات استعمال کی جائیں کہ وہ ہر غبار سے پاک ہیں۔ اگر کوئی اصطلاح مسلمان کسی ضرورت سے ایجاد کر لیں اور اس کے معانی شرع کے مطابق ہوں، اس کے مغائر نہ ہوں تو اس میں کوئی ہرج نہیں لیکن اگر اس اصطلاح کے ساتھ ایسے مفاد ہم وابستہ ہو جائیں جو غیر شرعی ہوں تو بہتر یہ ہے کہ اسے استعمال نہ کیا جائے۔ لہذا ہم ذاتی طور پر وصول الی اللہ کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے اور تصوف اور اس کی متعلقہ دیگر اصطلاحات سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی بجائے قرآنی اصطلاحات جیسے ”تزکیہ نفس، عبودیت، رضائے الہی..... وغیرہ استعمال کرنا پسند کرتے ہیں۔

امید ہے ہماری ان گزارشات سے زاہد اقبال صاحب کا ذہن واضح ہو گیا ہوگا۔ اگر اب بھی کسر باقی ہو تو وہ بتائیں ہم وضاحت کے لیے دوبارہ حاضر ہیں۔ سطور بالا میں ہم نے اپنے علاوہ جناب احمد جاوید صاحب کے ملفوظات سے بھی استفادہ کیا ہے تاہم اگر کسی صاحب علم و فضل کی رائے میں ہماری بات کمزور ہو تو البرہان کے صفحات ان کے ارشادات کے لیے حاضر ہیں۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا  
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا  
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا  
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا  
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا  
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

## تزکیہ نفس - چند بنیادی مباحث (۲)

(سوالاً جواباً)

سوال: لیکن جب آپ کہتے ہیں کہ شریعت کی تعلیمات تزکیہ نفس کے لیے کافی ہیں تو اب اگر کوئی شخص اپنے نفس کا تزکیہ کرنا چاہے تو آپ کو چاہیے کہ اسے کہیں کہ شریعت کی طرف رجوع کر لیکن آپ کہتے ہیں کہ تصوف کی طرف رجوع کرو۔ کیا یہ غیر اسلامی رویہ نہیں؟

جواب: یقیناً ہمارا یہ ایمان ہے کہ صرف شریعت ہی نفس کا صحیح تزکیہ کر سکتی ہے اور تزکیہ کے لیے صرف اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اپنی اصل میں یہ بات نہایت محکم ہے اور اس میں کوئی جھول نہیں کہ تزکیہ نفس ہی شریعت کا ہدف ہے اور شریعت کے سارے احکام اس کا وسیلہ ہیں لیکن بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ہم خود رکاوٹیں کھڑی کر لیتے ہیں اور اس وسیلہ کو استعمال کر کے اس ہدف کو حاصل نہیں کر سکتے۔ گویا قصور ہمارا ہوتا ہے کہ ہم وسائل کو استعمال نہیں کر سکتے کہ ہدف تک پہنچ سکیں نہ کہ وسائل کا کہ وہ غیر مفید ہیں اور نہ ہدف کا کہ وہ ناقابل حصول ہے۔

معاملے کو مزید عام فہم بنانے کے لیے ہم دو مثالیں دیتے ہیں۔ اچھی صحت ہم سب کا ہدف ہے اور اس کا وسیلہ ہے طیب و صالح غذا۔ لیکن ایک شخص نے وقت بے وقت غیر مناسب غذا کھا کھا کر اپنے معدے کا ستیاناس کر لیا ہے۔ اب اسے بھوک ہی نہیں لگتی کہ وہ غذا کھائے اور اگر کھائے تو جزو بدن نہیں بنتی کہ اچھی صحت کا ہدف حاصل ہو۔ اب قصور نہ ہدف کا ہے (کہ وہ تو قابل حصول ہے) اور نہ وسیلہ کا (کہ صحیح غذا صحیح طریقے سے کھائی جائے گی تو لازماً اثر کرے گی) بلکہ قصور اس شخص کا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ غذا کھانے کا صحیح طریقہ کیا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس حالت میں اس شخص کو اچھی غذا کے میسر ہونے کا کوئی فائدہ نہیں، اسے پھل، بکھن، گوشت جو بھی کھلایا جائے اسے کوئی فائدہ نہ دے گا۔ یہ غذا جزو بدن بنے گی نہ اسے صحت حاصل ہوگی۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ پہلے اس کے معدے کا علاج کیا جائے تاکہ وہ غذا ہضم کر سکے اور غذا جزو بدن بن سکے۔

یہی حال اخلاقی اور روحانی صحت کا ہے کہ تزکیہ نفس کا ہدف قابل حصول ہے۔ احکام شریعت اس ہدف تک پہنچنے کا موثر اور مناسب وسیلہ ہیں لیکن بعض لوگ اپنے نفس (شخصیت) کو بیمار بنا لیتے ہیں یا وہ

بیمار ہو جاتا ہے (جن کے اسباب کئی ہو سکتے ہیں مثلاً والدین کی طرف سے صحیح تربیت میں غفلت، غلط نظام تعلیم و تربیت، غیر موزوں ماحول، بری صحبت وغیرہ) جس سے کہ وہ اس وسیلے کو استعمال نہیں کر سکتے یا کریں بھی تو اس کے موثر نتائج نہیں نکلتے۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ پہلے اس شخصیت کا علاج کیا جائے تاکہ وہ اس وسیلے کو موثر طریقے سے استعمال کرنے کے قابل ہو سکے۔ تصوف یہی کام کرتا ہے کہ وہ نفس (شخصیت) کا علاج کرتا ہے تاکہ وہ شریعت کے وسیلے کو استعمال کرنے کے قابل ہو جائے۔ گویا تزکیہ شریعت ہی کرتی ہے اور صرف وہی کر سکتی ہے۔ تصوف کا کام صرف یہ ہے کہ وہ شخصیت کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ احکام شریعت پر عمل کر سکے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص اسلام آباد جانا چاہتا ہے اور ریل کے ذریعے جانا چاہتا ہے۔ گویا اسلام آباد پہنچنا اس کا ہدف ہے اور ریل اس کا ذریعہ ہے لیکن اس کے پاس کرایہ نہیں کہ وہ ریل کا ٹکٹ خرید سکے یا وہ خود بچوں کو سکول لے جاتا اور لے آتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں کوئی دوسرا متبادل شخص موجود نہیں جو یہ کام کر سکے۔ گویا ریل کا ذریعہ استعمال کر کے اسلام آباد پہنچنے میں کچھ رکاوٹیں ہیں ورنہ ریل کے مستند ذریعہ نقل و حمل ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ جو اسلام آباد جانے والی ریل میں بیٹھے گا وہ (ان شاء اللہ) وہاں پہنچ جائے گا۔ اسی طرح تصوف کی حیثیت ان موانع کو دور کرنے کی ہے جو انسان کو شریعت کا وسیلہ استعمال کرنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ورنہ شریعت کے صحیح اور موثر وسیلہ ہونے میں کوئی شک نہیں بلکہ صحیح تر لفظوں میں صرف شریعت ہی وسیلہ ہے۔ تصوف تو اس وسیلے کو موثر طریقے سے استعمال کرنے اور موانع کو دور کرنے کا ایک معالجہ ہے۔

اب جیسا کہ ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ علاج ہر شخص کے لیے فرض اور واجب نہیں ہوتا۔ جو شخص صحت مند ہے اسے علاج کی ضرورت نہیں اور جو بیمار ہے وہ جب تک علاج نہیں کروائے گا صحت مند نہیں ہوگا اور ہر شخص اپنے بارے میں دوسروں سے بہتر یہ جانتا ہے کہ وہ صحت مند ہے یا بیمار اور اگر بیمار ہے تو معمولی مرض ہے یا مرض مزمن۔ اگر مرض معمولی ہے تو وہ معمولی پرہیز سے یا اپنے ذاتی علم کے مطابق چھوٹی موٹی دوا کھانے سے ٹھیک ہو جائے گا لیکن اگر مرض مزمن ہے تو ظاہر ہے کسی ماہر طبیب سے عرصے تک علاج کروانا پڑے گا۔ مطلب یہ کہ کوئی آدمی اگر شریعت کی تعلیمات پر اس طرح عمل کرتا ہے کہ اس کے مثبت نتائج اسے مل رہے ہوں اور وہ ان سے مطمئن ہو تو اسے کسی تصوف کی ضرورت نہیں لیکن اگر وہ خواہش و کوشش کے باوجود دین کی تعلیمات پر موثر طریقے سے عمل نہیں کر سکتا تو اسے خارجی مدد ضرور لینی چاہیے کیونکہ اللہ کی رضا کا حصول اور دینی تعلیمات پر موثر طریقے سے عمل اتنے عظیم الشان اہداف ہیں کہ ان سے محرومی کا ایک مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان سے محرومی اصل دین سے محرومی ہے۔

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ تصوف سراسر غیر اسلامی ادارہ ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: آج کل جو تصوف مسلمانوں میں مروج ہے اس کی بہت سی رسوم و رواج قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف ہیں، اس لیے بعض لوگ اسے تغلیباً غیر اسلامی کہہ دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے تصوف یا دوسرے جو ادارے قائم کیے، ان میں مرور زمانہ سے بہت سی غیر اسلامی باتیں بھی داخل ہو گئی ہیں لہذا اصول کی بات یہ ہے کہ ان کی جو باتیں خلاف قرآن و سنت ہوں ان کا انکار کیا جائے اور جو باتیں صحیح ہوں ان کی تصویب کی جائے۔

سوال: آپ کے نزدیک اصولاً تصوف کی کون سی باتیں قابل قبول اور صحیح ہیں اور کون سی ناقابل قبول اور غلط؟

جواب: ہمارے نزدیک جب صدر اسلام میں تصوف کی ابتدا ہوئی تو اس کے مقاصد بھی درست تھے اور بڑی حد تک طریق کار بھی لیکن بعد میں جور، جحانات ابھرے وہ یہ تھے:

۱- تصوف میں یونانی، ایرانی، مسیحی اور ہندی افکار کی آمیزش ہو گئی۔ اس آمیزش کے اکثر و بیشتر پہلو غیر اسلامی تھے۔ اسی طرح بعض سادہ لوح صوفیوں نے قرامطہ اور باطنیہ کے غالی شیعہ عقائد قبول کر لیے جو صحیح نہیں تھے۔

۲- صوفیاء میں سے بعض اہل علم نے تصوف کی غیر اسلامی جزئیات کو قرآن و سنت سے ثابت کرنا چاہا اور اس سلسلے میں قرآن و حدیث سے استنباط کے جو طریقے رائج کیے وہ جمہور علماء سے مختلف اور غیر صحیح تھے۔

۳- بعض اہل علم نے یونانی اور دیگر مذاہب کے سرّی فلسفوں سے متاثر ہو کر اسلامی تصوف کو بھی ایک فلسفہ بنا کر پیش کیا (وحدۃ الوجود وغیرہ)۔ یہ روش نہ صرف تزکیہ نفس کے لحاظ سے غیر مفید تھی بلکہ اس کی کئی تفصیلات بھی تعلیمات قرآن و سنت کے خلاف تھیں۔

۴- بعض اہل تصوف نے تزکیہ نفس کے لیے براہ راست کوششیں کیں جو بعد میں چار سلاسل کی صورت میں پروان چڑھیں۔ ان کے ہاں اکثر صورتیں قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق ہیں مثلاً صحبت اور ذکر وغیرہ اور بعض صوفیاء کی اختیار کردہ کچھ صورتیں غیر اسلامی ہیں جیسے ترک معاشرت اور ترک اکل و شرب و کلام، رقص و سرود، موسیقی اور منشیات کا استعمال وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ ہمارے نزدیک تصوف کا صرف وہ حصہ قابل قبول اور قابل اعتناء ہے جس کا ہدف

تزکیہ نفس ہو اور اس کا منہج بھی قرآن و سنت سے مستنبط ہو اور اس کے خلاف نہ ہو۔

سوال: آپ نے تصوف کے قابل قبول نظریات میں صحبت کو بھی شمار کیا ہے آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟

جواب: دیکھیے صحبت کے تصور کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اگر اپنے طرز عمل کو خود اسلام کے مطابق نہ ڈھال سکے تو خارجی مدد لے یعنی ایک ماہر اور پروفیشنل شخص کی مدد لے۔ یہ نقطہ نظر خالص سائنسی اور منطقی ہے اور اسلامی بھی۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلامی تعلیمات تزکیہ نفس کے لیے خود کفیل ہیں بشرطیکہ کوئی ان پر عمل کرے۔ اگر کوئی مسلمان مطمئن ہو کہ وہ اسلامی تعلیمات پر صحیح طریقے سے عمل کر رہا ہے تو یقیناً اسے کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر وہ سمجھے کہ وہ معصیت کا ارتکاب کر رہا ہے اور اپنی ذاتی کوششوں سے ترک معصیت پر قادر نہیں یا اسی طرح اگر وہ اعلیٰ درجے کا مسلمان بننا چاہتا ہے اور اپنی ذاتی کوششوں سے ایسا نہیں بن پاتا تو یقیناً ان دونوں صورتوں میں اسے خارجی مدد کی ضرورت ہے اور ایسی خارجی مدد وہی شخص بہم پہنچا سکتا ہے جس میں یہ دونوں خوبیاں (یعنی ترک معصیت اور درجہ احسان میں اعمال شریعت پر عمل) موجود ہوں، جو اسلامی تعلیمات کا ماہر ہو اور علم النفس میں دسترس رکھتا ہو، یعنی لوگوں کی ذہنی مشکلات، طبعی موانع اور ان کے مزاجوں کو سمجھتا ہو۔ ایسے شخص کو مربی (تربیت کرنے والا) مزی (تزکیہ کرنے والا) یا مرشد (رہنمائی کرنے والا) کہتے ہیں۔

جدید مغربی نفسیات بھی یہی کہتی ہے کہ جو شخص ذہنی اور نفسی طور پر غیر متوازن ہو جائے وہ عموماً اپنی مدد خود نہیں کر سکتا بلکہ اسے ایک ایسے ماہر امراض نفس کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی مدد کرے اس کے رویوں کو معتدل اور متوازن کر دے۔ فرق صرف یہ ہے کہ معاصر مغرب میں مریضانہ رویہ یہ ہے کہ آدمی اپنے طرز عمل سے ان اصول و اقدار کی مخالفت کرے جو ان کی سوسائٹی میں مروج ہیں اور ہم مسلمانوں کے نزدیک مریضانہ رویہ یہ ہے کہ آدمی اللہ و رسول کے احکام کی مخالفت کرے۔ اسلام کے نزدیک جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کا رویہ رکھتا ہو وہ صالح ہے، صحت مند شخصیت رکھتا ہے نفس مطمئنہ کا حامل ہے، وہ دنیا میں بھی کامیاب ہے اور آخرت میں بھی۔ اور جو شخص اللہ سے بغاوت کرے اور اس کے احکام کی تابعداری نہ کرے کا رویہ رکھتا ہو وہ غیر صحت مند شخصیت رکھتا ہے۔ مریض نفس ہے اور قابل علاج۔

صحبت صالح کا تصور اسلام کا ایک مستحکم تصور ہے اس کے لیے قرآن کی آیات اور صحیح احادیث

موجود ہیں اور ہم اپنی روزمرہ زندگی میں اچھی صحبت کے اچھے اثرات اور بری صحبت کے برے اثرات کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرتے رہتے ہیں۔ صرف اسی ایک بات پر غور فرمائیے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کا ہم اتنا احترام اور ان سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں؟ محض اس لیے ناکہ انہیں آنحضرت ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل تھا۔ صحابہ کو صحابہ کہتے ہی اس لیے ہیں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی صحبت اٹھائی تھی اور آنحضرت ﷺ نے ان کی تربیت کی تھی۔ صحبت کا ادارہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کی اسی سنت پر قائم ہے کہ جو مسلمان اپنا تہذیب خود نہیں کر سکتا وہ صحابہ کی اتباع میں کسی مزی کے پاس جائے اور وہ مزی آنحضرت ﷺ کی اتباع میں آپ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اس کا تذکیہ کرے۔

ویسے بھی یہ ہماری روزمرہ زندگی کا معمول ہے کہ جو کام ہم خود نہیں کر سکتے یا صحیح اور اچھے طریقے سے نہیں کر سکتے اس کے لیے اس کام کے ماہر کے پاس چلے جاتے ہیں۔ ہمیں کپڑے سلوانے ہوں تو اچھے درزی کے پاس جاتے ہیں، مکان بنوانا ہو تو ماہر تعمیرات کے پاس جاتے ہیں، کوئی دینی مسئلہ ہو تو عالم دین کے پاس جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر دین پر عمل کرنے میں ہمیں کوئی دقت پیش ہو تو کسی ایسے مربی کے پاس جانے میں آخر کیا ہرج ہے جو اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکے؟

سوال: لیکن دینی احکام پر عمل کرنے میں ایسی کیا رکاوٹ پیش آ سکتی ہے جسے انسان خود دور نہ کر سکے؟

جواب: غالب نے کہا تھا۔

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کیوں نہیں آتی؟ بس اتنا سا مسئلہ ہے۔ آپ نماز پڑھنا چاہتے ہیں لیکن نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ قرآن کی تلاوت کرنا چاہتے ہیں لیکن تلاوت میں دل نہیں لگتا، آپ فوراً اُکتا جاتے ہیں۔ آپ روزہ رکھتے ہیں لیکن محسوس کرتے ہیں کہ سوائے بھوک پیاس کے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں تو چین جاپان کی باتیں سوچتے رہتے ہیں اور کوشش کے باوجود آپ اس کیفیت سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔

یہ محض چند مظاہر ہیں جن سے ہمیں عام طور پر واسطہ پڑتا ہے۔ آپ انہیں طبعی عوارض کہہ لیجیے، نفسی موانع کہہ لیجیے یا کچھ اور۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایسی کیفیت ہے جس میں آپ شرعی احکام پر عمل نہیں کر پاتے یا اس طرح عمل نہیں کر پاتے جس طرح شریعت کا تقاضا ہے اور ان کے بجالانے سے آپ پر وہ

نتائج مرتب نہیں ہو پاتے جو اصولاً ہونے چاہئیں اور اپنی مدد آپ کرنے کی جتنی کوششیں بھی آپ کرتے ہیں اس میں آپ کو کامیابی نہیں ہوتی۔ اس حالت میں آپ کے پاس صرف ایک ہی حل رہ جاتا ہے کہ آپ خارجی مدد لیں اور کسی ایسے شخص کی مدد لیں جو آپ کو اس حالت سے نکلنے میں مدد دے تاکہ آپ موثر طریقے سے شریعت کے احکام پر عمل کر سکیں۔

سوال: ذکر کو بھی آپ ﷺ نے تصوف کی قابل قبول بنیاد کہا تھا اس کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: حدیث جبریلؑ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اعمال کو بہترین طریقے سے انجام دینے کا طریقہ یہ تعلیم فرمایا کہ ہر کام کرتے ہوئے تصور یہ ہو کہ ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں یا اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے گویا اللہ کا استحضار، اسے یاد رکھنے کا تصور۔ انسان چونکہ خطا کا پتلا ہے لہذا کو بھول جاتا ہے، اللہ کو بھول جاتا ہے اور اپنی حیثیت کو بھول جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ سے بھی بھول ہی ہوئی تھی جس نے انہیں جنت سے نکلوا دیا۔ تو اللہ کی معصیت سے بچنے اور اعلیٰ طریقے سے اعمال عبودیت بجا نہ لاسکے میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ انسان کا بھول جانا ہے، اس کی غفلت ہے۔ غفلت اور بھول کی اس بیماری کا علاج کیا ہے؟ یاد کرنا۔ یاد کرنے کو عربی میں ذکر کہتے ہیں۔ اللہ کے ذکر سے مراد ہے اللہ کو یاد کرنا۔ جب ہم اللہ کو یاد کریں گے، اسے یاد رکھیں گے، اس کی عظمت و کبریائی کو یاد رکھیں گے، اس کی قوت و ہیبت کو یاد رکھیں گے، اپنی بندگی اور کم مانگی کو یاد رکھیں گے تو ہم اس کے احکام کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ ہمارے دینی اعمال کی کوالٹی جو گر جاتی ہے تو اس کا سبب بھی غفلت ہے۔ جب اللہ یاد ہوگا، ہر وقت اس کی حضوری کا تصور ہوگا کہ اللہ ہمیں یہ کام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے تو اعمال کی کوالٹی خود بخود بہتر ہوتی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بار بار کثرت سے ذکر کرنے کا حکم دیا ہے، نماز بھی اللہ کے ذکر ہی کی ایک صورت ہے لیکن فرمایا کہ نماز کے علاوہ بھی ہر وقت اللہ کا ذکر کیا کرو، اٹھتے ذکر کرو، بیٹھے ذکر کرو، لیٹے ذکر کرو، مشغولیت کے وقت ذکر کرو، فارغ وقت میں ذکر کرو، جنگ کے وقت ذکر کرو، امن کے وقت ذکر کرو، اکیلے ذکر کرو، مل کر ذکر کرو، ہر وقت اللہ کا ذکر کرو، نبی کریم ﷺ نے اس کا عملی نمونہ ہمیں دکھا دیا کہ آپ ﷺ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ کتب احادیث اٹھا کر دیکھیے کہ کھانا کھاتے، پانی پیتے، کپڑے پہنتے، جوتے پہنتے، گھر سے نکلتے، گھر میں داخل ہوتے، مسجد میں جاتے اور باہر نکلتے، غسل خانے میں جاتے اور باہر آتے، خوشی کے وقت، غم کے وقت، آسائش میں، تنگی میں، سفر میں، حضر میں، سوار ہوتے، پیدل چلتے، صبح کے وقت، شام کے وقت، سوتے وقت، جاگتے وقت غرض زندگی کے ہر فعل میں اور ہر لمحے میں آپ ﷺ اللہ کو یاد کرتے تھے اور آپ ﷺ کے تتبع میں یہی حال صحابہ



کرام کا تھا۔ تو خلاصہ یہ کہ قرآن و سنت کی رو سے غفلت اور معصیت سے بچنے کا اور اعلیٰ کو الٹی کے اعمال بجالانے کا نسخہ ہے اللہ کا ذکر یعنی اللہ کو یاد کرنا، اسے یاد رکھنا، ہر وقت اس کی حضوری کا تصور رکھنا۔ یہ تصور جتنا مستحکم ہوگا آدمی اتنا ہی اعلیٰ درجے کا مسلمان ہوگا۔

تصوف کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ ذکر اتنی کثرت سے کیا جائے کہ غفلت دور ہو جائے اور اس کے نتیجے میں معصیت سے بھی جان چھوٹ جائے اور درجہ احسان بھی حاصل ہو جائے۔

سوال: چلیے یہ تو مان لیا کہ قرآن و سنت میں ذکر کرنے کا حکم موجود ہے لیکن یہ جو آج کل کے صوفیوں نے چکر چلا رکھا ہے کہ سانس کے ذریعے ذکر، گردن ٹیڑھی کر کے ذکر، آنکھیں بند کر کے ذکر، قلبی ذکر، جہری ذکر، مراقبے کے ساتھ ذکر..... کیا یہ سب بدعت نہیں کیونکہ قرآن و سنت میں ان صورتوں کا بہر حال کوئی تذکرہ نہیں؟

جواب: بات یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ذکر کے لیے کوئی خاص شکل اور ہیئت مقرر نہیں کی۔ نماز بھی ایک ذکر ہے۔ اس کی شکل شریعت نے مقرر کر دی، اب کوئی اس کی مخالفت کی جرات نہیں کر سکتا۔ کرے گا تو مردود و ٹھہرے گا۔ لیکن جب خود شارع نے ذکر کی کثرت کا حکم دیا اور اس کی کوئی خاص شکل معین نہیں کی (سوائے ان صورتوں کے جن پر آنحضرت ﷺ کا عمل تھا یا جن کا آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ تو مسنون عمل ہے) تو کسی پر یہ اعتراض کرنا فضول ہے کہ وہ کس طریقے سے ذکر کرتا ہے۔ کوئی جس طریقے سے چاہے ذکر کرے وہ قرآن و سنت کے حکم ہی کی پیروی کرتا ہے۔

یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسری یہ کہ اگر کسی مصلحت کے تحت عارضی طور پر کوئی خاص شکل ذکر کی متعین کر لی جائے تو اس میں بھی کوئی ہرج نہیں، نہ اس میں کوئی بات خلاف قرآن و سنت ہے بشرطیکہ اپنی اس عادت و مصلحت کو دین و شریعت نہ سمجھا جائے بلکہ اسے انفرادی سہولت اور مصلحت اور تدبیر ہی سمجھا جائے مثلاً ایک شخص طے کر لیتا ہے کہ وہ عشاء کی نماز کے بعد سود دفعہ تسبیح، سود دفعہ تحمید اور سود دفعہ استغفار پڑھے گا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں تو عشاء کے بعد تھکا ہوا ہوتا ہوں ذکر کے لیے نہیں بیٹھ سکتا، میں صبح کی نماز کے بعد کچھ چیزیں متعین کر کے پڑھ لیا کروں گا، کوئی سیر کرتے ہوئے پڑھ لیتا ہے، کوئی گاڑی چلاتے ہوئے اکیلا کچھ چیزیں ذرا بلند آواز سے پڑھ لیتا ہے..... تو ان ساری صورتوں میں کوئی ہرج نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ذکر کرتے ہوئے کوئی ایسا صیغہ نہ استعمال کیا جائے جو خلاف شریعت ہو اور یہ کام اس طریقے سے نہ کیا جائے کہ دوسروں کو تکلیف یا اذیت ہو۔ باقی امور مباحات میں سے ہیں اور ہر آدمی اپنی سہولت اور ضرورت سے ان کا تعین کر سکتا ہے۔

صوفیاء (خصوصاً متاخرین صوفیاء) نے جو ذکر کے مختلف طریقے متعین کر رکھے ہیں ان کے نزدیک بھی ان طریقوں کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ یہ محض معاملے اور تدبیر کی نوعیت کے ہیں۔ وہ ان کی تلقین اس لیے کرتے ہیں کہ برسوں کے تجربات سے انہوں نے انہیں مفید پایا ہے اور ان کے ہاں بھی یہ طریقے کوئی لوہے کی لکیر نہیں ہوتے۔ یہ مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہوتے ہیں اور ایک شخص کو اگر کوئی چیز آج تلقین کی جاتی ہے تو چند دن یا چند ہفتوں بعد اسے بھی بدل دیا جاتا ہے اور دوسری نئی چیز بتادی جاتی ہے۔

جہاں تک ذکر کے وقت روشنی اور آنکھیں بند کرنے، سانس کے ساتھ ذکر کرنے، مراقبات، لطائف ستہ وغیرہ کا تعلق ہے تو ان کی اصل صرف اتنی ہے کہ متاخرین صوفیاء نے یہ دیکھ کر کہ لوگ کم ہمت ہو گئے ہیں، فکری انتشار اور ذہنی تشمت کا شکار ہو گئے ہیں اور ذکر سے بھی فائدہ اٹھانا ان کے لیے آسان نہیں رہا تو انہوں نے ارتکازِ توجہ کی مشقوں کو بھی ذکر سے مرتبط کر دیا۔ ارتکازِ توجہ کی مشقوں سے مقصود صرف یہ ہے کہ ذہنی یکسوئی میسر آ جائے جو کسی بھی کام کے لیے ضروری ہے۔ یہ مظہر بعض لوگوں کے لیے خلیان کا سبب اس لیے بنا کہ ارتکازِ توجہ کے اس طرح کے عمل دیگر مذاہب باطلہ مثلاً ہندوؤں، بدھوں وغیرہ میں بھی موجود ہیں تو اس اشتراکِ ظاہری سے وہ یہ سمجھے کہ صوفیاء کے یہ اعمال غیر اسلامی اور قابلِ ردّ ہیں لیکن اگر مندرجہ ذیل حقائق سامنے رکھے جائیں تو کوئی اشکال باقی نہیں رہتا:

۱- یہ کہ ان مظاہر کی کوئی شرعی حیثیت نہیں اور انہیں کوئی تقدس حاصل نہیں۔

۲- یہ ہدف نہیں محض وسیلہ ہیں نفس کو تزکیے کے قابل بنانے کا۔

۳- اور وسیلہ بھی محض اس شخص کے لیے جو ان کا محتاج ہے۔

۳- اور وسیلہ بھی محض عارضی کہ یکسوئی حاصل ہو جانے کے بعد ان کی کوئی ضرورت اور افادیت نہیں۔

۴- اور یہ کہ اصل چیز اللہ کا ذکر ہی ہے جس سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔

۵- غیر مسلموں کے ایسے انسانی تجربات سے فائدہ اٹھالینے میں شرعی طور پر کوئی ہرج نہیں جن میں ہمارا فائدہ ہو اور جن میں کوئی چیز خلافِ اسلام نہ ہو۔ اب ہم نہیں سمجھتے کہ ارتکازِ توجہ کی مشقوں میں کیا غیر اسلامی پہلو ہے جب کہ اس کے نتیجے میں اسلامی اعمال بجالانے میں بہتری عملاً قابلِ مشاہدہ ہے۔

## وحدت امت - ہر فرد کی ذمہ داری

اختلاف مسائل کوئی نئی بات نہیں، اصحاب رسول میں بھی بعض مسائل میں اختلافات ہوئے، بعد کے ادوار میں بھی ایسا ہوتا رہا، لیکن اختلاف، اختلاف رائے تک ہی رہا۔ مخالفت کی نوبت کبھی نہ آئی، کیونکہ ان اختلافات کو متعلقین نے نبی اکرم ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق قرآن حکیم اور فرامین نبوت کی روشنی میں حل کیا اور ادھر ادھر جانے کے بجائے، براہ راست ان دونوں (قرآن وحدیث) کی طرف رجوع فرمایا اور یوں امت میں کوئی دراڑ نہ پڑی۔

یہاں تک کہ ائمہ اربعہ کا دور آیا، ان کے دور سعید میں بھی ان مختلف فیہ مسائل کے ضمن میں کم و بیش وہی کیفیت رہی۔ باہمی رواداری میں سر مو فرق نہ آیا اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی مصدقہ تحقیق کے مطابق یہ سنہرے دور ۴۰۰ سال تک قائم رہا اور مسلمان اس تقسیم اور بعد میں ہونے والی تقسیموں اور نسبتوں سے مکمل طور پر نا آشنا تھے۔ کسی امام کی فقہ پر کسی کو اصرار نہ تھا، کسی امام کے نام پر کوئی حد بندی نہ تھی، جبکہ ہر امام کے ہزاروں نہیں لاکھوں شاگرد اور معتقدین تھے۔ ایسا اس لئے تھا کہ ان چاروں ائمہ کرام کا فرمان تھا کہ میرے قول کے مقابلے میں اگر کوئی صحیح حدیث مل جائے تو اس صحیح حدیث کو پکڑ لو اور میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔ ان کے شاگردوں نے ان ائمہ کرام کے اس فرمان کو پلے باندھ لیا اور یوں اس اندھی تقلید کا دروازہ بند کر دیا، جس کے مظاہرے امت کے اندر غیظ و غضب کی صورت میں بعد میں دیکھے جانے لگے۔

ہوایہ کہ ان ائمہ کرام کے بعد اسلامی ممالک میں ان کے تبعین فرماں رواؤں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور ان فرماں رواؤں نے بزور بازو اپنے اپنے امام کی فقہ مسلط کی تو اس امت واحدہ کی شکل و صورت ہی کچھ کی کچھ ہو گئی۔ ان ملکوں کے حکمرانوں نے اپنے امام کی فقہ کے علاوہ دوسرے امام کی فقہ پر عمل کرنے والوں کو برداشت نہ کیا اور ان پر زبردستی اپنے امام کی فقہ ٹھونسنے کی کوشش کی۔ جو نہ مانا اسے کچل ڈالا۔ یوں امت واحدہ اور شجر اسلام، جس کی آبیاری داعی اسلام ﷺ اور ان کے جانباز و جانثار صحابہ کرام نے اپنا خون دے کر کی تھی اور اسے کوئی آنچ نہ آنے دی تھی اور ائمہ کرام نے اس رویہ کی پاسداری کرتے ہوئے اور اس کی بنیاد پر اس امت کو امت واحدہ بنا رکھا تھا، ان ظالم حکمرانوں اور اس وقت کے متعصب علماء نے

اس امت کو نہ صرف ٹکڑے ٹکڑے کر دیا بلکہ باہمی تشدد دانہ اور متعصبانہ رویوں کا زہر بھی امت میں گھول دیا<sup>(۱)</sup>۔ امت پہلے تو ان رویوں کی بنیاد پر ائمہ کرامؒ کے نام پر چار ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی اور شجر اسلام کو ان ظالموں نے کاٹ کاٹ کر آپس میں بانٹ لیا جو کہ اس امت کی بربادی کا آغاز تھا اور یہی وہ بد قسمت لمحات تھے جن میں اختلاف مخالفت میں ڈھل گیا اور پھر یہ اختلاف مسائل و فقہ کی بات نہ رہی، بلکہ امت باہمی مخالفتوں، جنگ و جدال اور ایک دوسرے کے غیظ و غضب کا شکار ہوتی رہی۔

اس کے بعد یہ امت جو تقسیم ہونا شروع ہوئی تو اس ہٹارے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سنی، شیعہ بریلوی، دیوبندی، چشتی، قادری، صابری، نظامی، اویسی، عطاری، وغیرہ وغیرہ..... ایسے ایسے عجیب و غریب نام اور نسبتیں سننے اور پڑھنے میں آتی ہیں کہ ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے اور اب تو نوبت بایں جارسید کہ ہر امام مسجد اور خطیب مسجد کو ان کے نمازیوں اور معتقدین نے اتنا اونچا مقام دے دیا ہے اور ان خطباء و ائمہ مساجد نے خود کو ایسے مقام پر فائز کر لیا ہے کہ دین و مسائل کے حوالے سے وہ بذات خود ایک فرقہ اور گروہ کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ گو کہ اس حصہ گفتگو کی کہانی طویل اور المناک ہے اسے ہم کسی دوسری صحبت پر اٹھا رکھتے ہیں۔

آئیے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ اس داستان کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جو ہماری آج کی گفتگو کا اصل موضوع ہے اور ایمان افروز بھی اور یقیناً ہمارے لئے بڑی حد تک بہترین راہِ عمل بھی۔ ہم ماضی بعید کی بات نہیں کرتے۔ ماضی قریب کی بعض روشن کرنیں ایسی ہیں کہ ان سے رات کے اندھیروں میں اجالا ہو جاتا ہے۔ وہ فاتحِ قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، میر الہمدیث مولانا محمد ابراہیم میرسیالکوٹیؒ، استاذ پنجاب مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبدالحی لکھنویؒ اور اس دور کے ان گنت اکابرین الہمدیث و احناف ایسے ہیں جن کی مسلکی رواداری کے بیسیوں واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جن میں باہمی الفت و محبت، رواداری، ایک دوسرے کی اقتدا میں نمازوں کا اہتمام، ایک دوسرے کے احترام و محبت میں آمین، رفع الیدین، وتروں کے طریق ادا نیگی، دعائے قنوت، ایسے مسائل میں اپنے اپنے مسلک و موقف سے ہٹ کر دوسرے کے مسلک پر عمل پیرا ہونے اور باہمی رشتوں ناطوں تک کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ پھر احناف دیوبند کے جید عالم دین مولانا احمد علی لاہوریؒ جن کے ہزاروں مرید تھے، نے نمازِ عیدین کے پڑھانے کا اس وقت تک اہتمام نہیں فرمایا جب تک سرخیل الہمدیث خاندانِ غزنویہ کے چشم و چراغ مولانا

(۱) مصنف کی اس بات سے اتفاق مشکل ہے کہ مسالک میں عدم برداشت کی وجہ بعض حکمرانوں کی طرف سے بعض فقیہوں کا زبردستی نفاذ ہے۔ مدیر

سید محمد داؤد غزنویؒ نماز عیدین پڑھاتے رہے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ اپنے مریدوں سمیت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کی اقتداء میں ہی نماز عیدین ادا فرماتے رہے۔ مولانا احمد لاہوریؒ نے بزرگ اہلحدیث عالم مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ سے رشتہ داری بھی کی۔

احناف کے سرخیل مفتی محمد حسنؒ کے خاندان غزنویہ سے الفت و مودت کے تعلقات توروشن و آشکار تھے۔ ماضی قریب سے متصل حال کے احوال دیکھے جائیں، تو یہاں بھی کچھ ایسی ہی تابناک مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بھٹو کے ابتدائی دور کی اینٹی سوشلزم تحریک، تحریک تحفظ ختم نبوت (۱۹۵۳-۱۹۷۷)، تحریک استیصال بھٹو (۱۹۷۷ء) میں تمام مسالک کے جید علماء کرام نے جس ملی، قومی اور مسلکی وحدت و یگانگت کا ثبوت پیش کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بہت ہی مثالی تھا تو قطعی طور پر غلط نہ ہوگا۔ ان تمام تحریکوں میں علماء و مشائخ نے اپنے اور بیگانے کی تمیز ختم کر کے یک جان ہو کر مثبت کردار ادا کیا۔

اینٹی سوشلزم کی تحریک میں جب مولانا احتشام الحق تھانویؒ فیصل آباد کی جماعت اہلحدیث کی دعوت پر تشریف لائے تو جامعہ مسجد مبارک اہلحدیث ٹنگمری بازار میں ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں استقبالیہ اس عاجز نے پیش کیا۔ بعد ازاں شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ، مولانا محمد اسحاق چیمہ، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا احتشام الحق تھانویؒ اور دیگر حضرات نے خطاب فرمایا اور آخر میں خور و نوش کا سلسلہ چلا، اس تقریب کے اختتام پر مولانا تھانویؒ کو اباجی (مولانا عبدالرحیم اشرف) نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، جسے انہوں نے بصد خوشی قبول فرمایا، بلکہ رات قیام کا عندیہ بھی دیا۔ جس پر اباجی بہت خوش ہوئے، اباجی نے چند دیگر علماء کرام کو بھی مدعو کر لیا جن میں مولانا محمد اسحاق چیمہ، مولانا محمد صدیق، مفتی زین العابدین اور مولانا تاج محمود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رات کھانے کے بعد عشاء کی نماز ہوئی، جماعت کے لئے یہ مقتدر علماء ایک دوسرے کو جماعت کروانے کا کہتے رہے۔ بالآخر مولانا احتشام الحق تھانویؒ کو آگے کھڑا کر دیا گیا، مولانا تھانویؒ نے آمین بلند آواز میں کہی، رکوع و سجود، قعدہ، قومہ، جلسہ کا خاص اہتمام کیا اور بالخصوص انہوں نے رفع یدین بھی کیا۔ ادھر مولانا محمد صدیق، مولانا محمد اسحاق چیمہ نے رفع یدین نہیں کیا اور مفتی زین العابدین، مولانا تاج محمود کو رفع یدین کرتے دیکھا اور آمین کی آواز بھی سنائی دی۔ نماز سے فراغت کے بعد چائے کا دور چلا۔ اس وقت کے سیاسی حالات پر گفتگو ہونے لگی۔ بھٹو، سوشلزم اور دیگر مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، ان علماء کرام نے آئندہ کے حالات کے ضمن میں جن خدشات کا اظہار کیا، بعد میں وہ صحیح ثابت ہوئے۔

جب یہ حضرات اس گفتگو سے فارغ ہوئے تو میں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مولانا تھانویؒ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کی: ”مولانا محترم! ابھی نماز میں آپ بزرگوں نے جو نقشہ پیش کیا، کیا یہ نقشہ گاہے بگاہے مختلف مقامات پر پیش نہیں کیا جاسکتا؟ تاکہ یہ خوشبو سدا بہار بن جائے۔ مولانا تھانویؒ ابھی

اس سوال کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ مفتی زین العابدینؒ مسکرائے اور بولے: آپ ہمیشہ موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں اور گردن سے دبوتے ہیں۔ ابھی وہ مزید کچھ کہنے ہی والے تھے کہ مولانا تھانویؒ بولے: عزیزم خالد صاحب! بات یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم نے دیواروں کو مضبوط اتنا کر لیا ہے کہ انہیں گرانے کی ہمت جتنی چاہیے اتنی ہے نہیں۔ اباجی فوراً گویا ہوئے۔ ”اس کام کے لئے ہمت سے زیادہ جرأتِ رندانہ کی ضرورت ہے، اگر قائدینِ محترم جرأت سے کام لیں اور اپنے معتقدین کی ذہنی تربیت کریں اور اس کے ساتھ ساتھ عملاً گاہے بگاہے ایسے اقدامات کیے جاتے رہیں تو ان شاء اللہ بہت جلد حالات تبدیل ہو جائیں گے۔“

مولانا تھانویؒ بولے: ”اس مبارک کام کا آغاز آپ کے شہر سے ہونا چاہئے۔ مولانا سحاق چیمہؒ نے فرمایا: ”اس مبارک کام کا آغاز ہمیں سے ہوگا، ان شاء اللہ۔ مولانا محمد صدیقؒ فوراً اٹھے اور مولانا تھانویؒ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور ان سے بغل گیر ہوئے اور دیر تک بغل گیر رہے اور بولے: ”مولانا! ہم تو آپ کے حکم کے تابع ہیں۔ آپ جو فرمائیں گے ہم حاضر ہیں۔ ویسے اس کام کے لیے مولانا عبد الرحیم اشرف زیادہ موزوں ہیں کیونکہ یہ وحدتِ امت کے بڑے علم بردار ہیں بلکہ ان کی زندگی کا مشن ہی یہی ہے۔ آپ ان پر ذمہ داری ڈالیں، ہم سب ان کے ساتھ ہیں۔“ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ مولانا محمد صدیقؒ مولانا تھانویؒ کے بعد باری باری سب سے بغل گیر ہوئے اور آخر میں فرمایا: ”آپ ہماری مسجد اہل حدیث امین پور بازار سے اس مبارک کام کا آغاز کریں اور میں مولانا اشرف صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس کی تیاری کریں۔“

اباجی فرمانے لگے: وحدتِ امت کا مشن تو تمام اہل علم اور صاحبِ درد کا مشن ہونا چاہیے اور یہ ان کی ذمہ داری بھی ہے، میں اس کے لیے پہلے بھی حاضر تھا، اب بھی حاضر ہوں، آئندہ بھی رہوں گا، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے، بلکہ میری یہ خوش نصیبی ہے کہ اس مبارک کام کا آغاز میرے غریب خانے سے ہو رہا ہے۔ اب ہمیں اس نشست اور اس اہم فیصلہ کے بعد کمر بستہ ہونے کی ضرورت ہے، مجھے ڈر یہ ہے کہ ہم جتنے سرگرم اس وقت ہیں، ہم خدا نخواستہ یہاں سے اٹھ کر اتنے ہی ٹھنڈے نہ پڑ جائیں اور اگر ایسا ہو گیا تو شاید پھر ایسا موقعہ نہ ملے اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس تحریک کو پورے ملک میں آگ کی طرح پھیلا دیا جائے، تاکہ بروقت اور بیک وقت اس مہم کا آغاز ہو جائے اور جو نتائج مطلوب ہیں، وہ ہم حاصل کر سکیں۔ میری بلکہ ہم سب کی مولانا تھانویؒ سے گزارش ہے کہ وہ اس موجودہ مہم (اینٹی سوشلزم) کے ساتھ ساتھ اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھائیں اور وحدتِ امت کی تحریک کو عملی طور پر لے کر چلیں اور جہاں تک ممکن ہو بریلوی مکتبہ فکر کے علماء اور عوام کو بھی ساتھ شامل کر لیں۔ اس بات کی تائید تمام مقتدرین نے فرمائی اور مولانا تاج محمودؒ کی اس بات پر مجلس اختتام کو پہنچی۔

کس قیامت کے یہ نامے

مولانا ارشاد الحق اثری ☆

## ڈاکٹر شریعتی اور خالد جامعی صاحب کے مضامین پر تبصرہ

محترم جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

’البرہان‘ باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ مل رہا ہے اور یہ ناکارہ اور ادارہ کے رفقاء اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ اس دفعہ شمارہ اپریل کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اپریل کے شمارے میں ڈاکٹر علی شریعتی کا مضمون ’اسلام اور تصور انسان‘ پر آپ کی تنقید خوب ہے۔ میں یہ مضمون پڑھ رہا تھا اور میرا فوس مسلسل بڑھ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے کیسے شامل اشاعت کر دیا لیکن بعد میں آپ کے وضاحتی بیان میں کچھ تشفی ہوئی تاہم ان کی بہت سی باتوں سے آپ نے صرف نظر فرمایا، معلوم نہیں کیوں؟

بشر و انسان کی تقسیم بجائے خود کسی علمی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ انسان ایک تصور بنا لے تو ادھر ادھر سے اس کی تائید میں تانا بانا بنا لیتا ہے۔ اولاً تو قل انما انا بشر مثلکم سورۃ مریم کی نہیں سورۃ الکہف کی آیت کریمہ ہے۔

ثانیاً: بشر کے بارے میں ڈاکٹر شریعتی کی فکر ڈارون سے مستعار لی گئی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

”بشر سے قرآن کی مراد دو ٹائگوں کی وہ مخلوق ہے جو طویل ارتقاء کے بعد اب چھ ارب کی

تعداد میں زمین پر پائی جاتی ہے۔“ (البرہان ص ۱۸)

آگے چل کے صاف لفظوں میں فرمایا گیا ہے:

’انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے جب کہ بشر بندروں کا خلیفہ ہے اور انہی کی ترقی یافتہ شکل

ہے۔“ (البرہان ص ۲۳)

مگر یہ فکر قرآن مجید کے بالکل خلاف ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جب زمین میں خلیفہ بنانا چاہا تو اس کا تعارف ’بشر‘ کے لفظ سے ہی کروایا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ مِّنْ بَشَرٍ مِّنْ صَلٰٰصٰلٍ (الحجر: ۲۸)

☆ رئیس ادارہ علوم اثریہ، مفکر بازار، فیصل آباد

دوسری جگہ فرمایا:

قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ مِّنْ بَشَرٍ مِّنْ طَيْنٍ (ص: ۷۱)

اسی 'بشر' کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے خلافت سے سرفراز فرمایا ہے۔ یہ بندروں کی ترقی یافتہ شکل سے نہیں بنایا گیا بلکہ مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اسی مٹی سے بنے ہوئے خلیفہ کی عظمت کو شیطان نے تسلیم کرنے سے انکار کیا اور آج جناب شریعت بھی اسی راہ کے راہ رو ہیں کہ وہ بشر نہیں انسان ہے حالانکہ انسان بشر سے جدا نہیں اس کے بارے میں بھی یہی فرمایا گیا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (الحجر: ۲۶)

رسول اللہ ﷺ سے اعلان کروایا گیا کہ ”انما انا بشر مثلكم“ بے شک میں تو تم ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ اسی 'بشر' کی عظمت کے منکرین نے کہا تھا وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذَا لَخُسِرُوْنَ (المؤمنون: ۳۴) اگر تم اپنے جیسے بشر کی اطاعت کرو گے تو تم یقیناً خسارہ پانے والے ہو گے۔ اس لیے بشر و انسان کی یہ تفریق و تقسیم بالکل غلط اور محض خانہ ساز ہے بلکہ مغربیت کی آئینہ دار ہے۔

ثالثاً: یہ بھی کہا گیا کہ نبی کریم ﷺ کا قول مبارک ہے: ”تخلقوا باخلاق اللہ“ (البرہان ص ۲۳)۔ مگر یہ قطعاً نبی کریم ﷺ کا قول مبارک نہیں ہے۔

رابعاً: یہ بھی کہا گیا کہ عیسائی اور مسلمان کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر ماں کے پیٹ میں لکھ دی جاتی ہے۔ اگر صحیح ہے تو انسان کا حق انتخاب رکھنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ (البرہان ص ۲۵)

گویا ڈاکٹر شریعتی اس بات کو صحیح نہیں سمجھتے کہ انسان کی تقدیر ماں کے پیٹ میں لکھ دی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ حدیث بخاری (۶۵۹۴) اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے بلکہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہی روایت صحابہ کی ایک جماعت سے منقول ہے چنانچہ انہوں نے اس حوالے سے مزید پندرہ صحابہ کرام سے اس حدیث کی تخریج کی ہے (فتح الباری ص ۴۷۷، ۴۷۹، ج ۱۱)

افسوس ہے کہ تقدیر کے حوالے سے کسی طالب علم، تاجر، مالک، مزدور، کسان نے استدلال کر کے اپنے آپ کو بے اختیار نہیں سمجھا نہ اسے تقدیر کا جبر سمجھ کے خاموشی سادھ لی اور ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئے لیکن جب ایمان و عمل کی باری آتی ہے تو تقدیر کو جبر سمجھ کے شعراء کے کلام کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جنہیں قرآن



پاک نے فی ”کل واد یھیمنون“ کا مصداق قرار دیا ہے۔

یہ کہنا بھی سراسر غلط ہے کہ ”ہمیں زمین پر آزاد چھوڑ دیا“ اللہ تعالیٰ نے قطعاً آزاد نہیں چھوڑا بلکہ زمین پر بھیجتے ہی فرمادیا: فَاِمَا يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هٰذَا فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد نہیں چھوڑا البتہ اختیار میں آزادی دی ہے کہ شکر گزار بنتا ہے یا ناشکری اختیار کرتا ہے۔ اس نکتہ کی آپ نے ماشاء اللہ خوب وضاحت کر دی ہے جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

### خالد جامعی صاحب کا مضمون

یہ تو تھی بات ڈاکٹر شریعتی کے حوالے سے، اب ایک بات شاہ نواز فاروقی اور جناب سید خالد جامعی حفظہما اللہ کی نگارشات کے حوالے سے بھی عرض ہے کہ بلاشبہ دینی جماعتوں کو تفریق سے بچنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے اور باہم قربت و رواداری کو فروغ دینا چاہیے مگر سیدنا ابراہیم اور سیدنا عیسیٰ علیہما السلام کے حوالے سے جو بات فرمائی گئی ہے وہ محل تامل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے مشرکین کا راستہ اختیار کرنے والوں پر رحمت کی دعا کی اور عیسیٰ علیہ السلام میدان حشر میں مشرک امت کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طالب ہیں۔ اس ناکارہ کا خیال ہے کہ یہ ان کے لیے رحمت و بخشش کی دعا نہیں بلکہ سفارش کے انداز میں ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کا ہے کہ چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو عذاب دے۔ بخشش کی دعا البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وعدہ کے مطابق اپنے والد کے بارے میں کی تھی لیکن جب واضح ہو گیا کہ اللہ کی دشمنی میں وہ رچا بسا ہے تو انہوں نے اس سے بھی بے تعلقی کا اعلان فرمایا جیسا کہ سورہ التوبہ: ۱۱۴ میں ہے۔ اگر دونوں علمائے کرام کی بات تسلیم کر لی جائے تب بھی عرض ہے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ ﷺ اور ان کی امت کو کیا حکم ہے؟ اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے بخشش کی دعا کریں خواہ وہ قرابت دار ہوں۔ (الایہ: التوبہ: ۱۱۳)۔ اس لیے اب زندگی میں تو ایمان اور بخشش کی دعا کی گنجائش ہے کہ اللہ سب کو دولت ایمان عطا فرمائے اور مغفرت و بخشش سے نوازے مگر کفر و شرک پر مرنے کے بعد رحمت و بخشش کی دعا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے سمجھنا قرآن مجید کے اس صریح حکم کے بعد درست نہیں۔

## نظام تعلیم

نظام تعلیم کے بارے میں آپ جس دل سوزی سے کوشش کر رہے ہیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ اسے ثمر آور فرمائے۔ ملک میں یکساں تعلیم اور قومی زبان اردو میں تعلیم ہی قوم کو علم کے زیور سے آراستہ کر سکتی ہے۔ گوری چٹری کے ہمارے غلام حکمران حق غلامی ادا کر رہے ہیں۔ وہ یہی چاہتے ہیں کہ طبقاتی نظام تعلیم کے لیے غلام پیدا ہوتے رہیں اور ہماری نمک حلائی ہوتی رہے مگر وہ نہیں سمجھ رہے کہ ہم قوم کو علم سے کس طرح محروم کرنے کے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو بر لائے اور قوم و ملک کو علم کی راہ پر ڈال دے۔ آمین

اللہ تعالیٰ پوری امت کو صراطِ مستقیم پر گامزن فرمائے اور ہم سب پر اپنی رحمت کی برکھا برسائے۔ آمین

والسلام، دعا جو

(ارشاد الحق اثری)

## شع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شع جلتی رہے اور یہ شع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زراعت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام..... پتہ.....  
فون.....

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 136 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

## اسلام اور جدیدیت کی کشمکش از محمد ظفر اقبال

البرہان اس سے پیشتر محمد ظفر اقبال صاحب کی کتاب 'اسلام اور جدید سائنس' نئے تناظر میں، کا تعارف کراچکا ہے جو مصنف کے علم و فضل اور سلیم الفکری کی آئینہ دار تھی۔ ان کی تازہ کتاب پر یہ تبصرہ تعارفی نوعیت کا ہے کیونکہ ہم اپنی بے ڈھب مصروفیات کی بناء پر ابھی پوری کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کر سکے۔ اس کا مقدمہ اور دیگر ابواب جستہ جستہ دیکھے ہیں اور ہماری رائے یہ ہے کہ مصنف کی یہ کتاب بھی علمی حلقوں سے داد و تحسین وصول کرے گی۔ متجددین کا علمی تعاقب ضروری ہے تاکہ علم، جدیدیت اور روشن خیالی کے نام پر جہالت بلکہ جاہلیت کے جو جراثیم وہ معاشرے میں پھیلا رہے ہیں ان کے قلع قمع میں مدد مل سکے۔ ستم ظریفی یہ کہ نہ وہ دینی علوم میں رسوخ رکھتے ہیں اور نہ انہوں نے دینی و عربی علوم کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے لیکن محض ایک غالب تہذیب کی بالادستی سے مرعوب و متاثر ہو کر اسلام کی مرمت کر کے اسے اس اسلام و مسلم دشمن تہذیب کے مطابق بنانا چاہتے ہیں۔

۵۲۱ صفحات کی یہ کتاب روایتی اسلامی فکر پر متجددین کے اعتراضات کا تحقیقی مطالعہ ہے اور اس میں 'مشہور اسلامی دانشور' ڈاکٹر منظور احمد اور نیاز فتح پوری کے افکار کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب منہاج علم اور مآخذ استدلال پر ہے۔ دوسرے باب میں اسلام کے دینی اور علمی منہاج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا باب جدید منہاج علم کے مآخذ و منابع پر ہے۔ چوتھا باب خطبہ نیاز۔ تبصرہ و تجزیہ پر مشتمل ہے جب کہ پانچواں باب نیاز 'فتح پوری'۔ بر عظیم کی علمی و ادبی تاریخ میں سنسنی خیزی اور سرفقے کے علمبردار کے موضوع پر ہے۔ چھٹا اور آخری باب ڈاکٹر منظور احمد اور سیکولرزم کو زیر بحث لاتا ہے۔

جدید تعلیم یافتہ حضرات خصوصاً یونیورسٹیوں کے نوجوان طلبہ میں سے جو مغربی فکر و تہذیب کو سمجھنا چاہتے ہوں اور مسلم فکر پر اس کے اثرات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں ان کے لیے یہ کتاب ناگزیر ہے اور ہر یونیورسٹی کے مرکزی کتاب خانے اور خصوصاً علوم اسلامی اور شعبہ عمرانی علوم کی لائبریریوں میں یہ کتاب ضرور موجود ہونی چاہیے۔ کتاب ادارہ علم و دانش کراچی نے شائع کی ہے اور یہ کراچی میں فضلی سنز، اردو بازار اور مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی (021-34594144، 0334-3432345) اور لاہور اردو بازار میں غزنی سٹریٹ پر کتاب سرائے اور دارالکتاب سے مل سکتی ہے اس پر قیمت درج نہیں۔

## ماہنامہ 'صفدر' کا فتنہ غامدی نمبر

مرتبین: مولانا احسن خدای و مولانا حمزہ احسانی

مولانا سرفراز خاں صفدرؒ کا سارا خانوادہ علمی نور علی نور ہے اور ان کے نوجوان پوتوں مولانا احسن خدای اور مولانا حمزہ احسانی نے ماہنامہ صفدر کا اجراء کر کے اس علمی روایت کو مزید آگے بڑھانے کا موثر سامان کیا ہے۔ مجلے کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ یہ اہم شخصیات و موضوعات پر ضخیم خصوصی نمبر شائع کرتا رہتا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے مجلہ صفدر کے فتنہ غامدی نمبر کی جلد اول ہے اور مدیران اس کے بعد دوسری جلد لانے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔

مجلے کا ۶۰۰ صفحات کا یہ خصوصی نمبر سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب تمہیدی امور سے متعلق ہے جب کہ دوسرے باب میں تحریرات اکابر ہیں جن میں مولانا محمد نافعؒ، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا سلیم اللہ خاں، مولانا عبد المجید لدھیانویؒ، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر، مولانا مفتی عبدالواحد اور دیگر اکابر علماء کی تحریریں شامل ہیں۔ تیسرے باب میں تجدید پسندوں کے قلمی و علمی فتنوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں جامعہ کراچی کے معروف اسلامی دانشور سید خالد جمعی صاحب کا مضمون متجددین کے طریق کار (بلکہ طریقہ و ارادات) کی خوب قلعی کھولتا ہے۔ چوتھا باب جاوید غامدی صاحب کے تعارف و پس منظر پر ہے۔ پانچویں باب میں غامدی افکار کا تحقیقی محاسبہ کیا گیا ہے۔ اس حصے میں ۲۵ علماء کرام نے ۲۵ اہم موضوعات پر غامدی صاحب کے افکار کا رد کیا ہے۔ چھٹے باب میں غامدی مذہب کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے جب کہ ساتویں باب میں غامدی صاحب کے افکار کے بارے میں ملک کی مقتدر دینی جامعات (جیسے جامعہ اشرفیہ لاہور، دارالافتاء و تحقیق لاہور، جامعہ الحمید لاہور، دارالعلوم مدنیہ بہاول پور اور جامعہ خیر العلوم خیر پور وغیرہ) کے فتاویٰ پیش کیے گئے ہیں۔

اصلاحی فکر کے خلاف ہمارا مضمون جامعہ اسلامیہ العالمیہ اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے جریدے سہ ماہی 'فکر و نظر' اسلام آباد میں 'قرآن و سنت میں باہمی تعلق' کے عنوان سے ستمبر ۱۹۹۷ء میں طبع ہوا تھا۔ پھر جب ہم نے البرہان کا اجراء کیا تو متفرق مختصر تحریروں کے علاوہ اکتوبر ۲۰۱۱ء میں ہم نے البرہان کا پورا شمارہ جاوید غامدی صاحب اور عمار خان ناصر صاحب کے افکار کے رد میں شائع کیا جسے اب ایک بروشر کی صورت میں الگ سے شائع کیا جا رہا ہے۔ جو دوسرے احباب غامدی صاحب کے مخدوش افکار کا رد کرتے رہے ہیں ان میں سلفی حضرات میں سے مولانا صلاح الدین یوسف اور ڈاکٹر حافظ زیبر صاحب

اور پروفیسر حضرات میں سے راقم کے علاوہ سید خالد جامعی صاحب اور مولانا محمد رفیق چوہدری صاحب کی تحریریں قابل ذکر ہیں۔ تاہم ضرورت اس بات کی تھی کہ روایتی علماء کے حلقے میں سے لوگ اُنھیں اور اس فتنے کی سرکوبی کے لیے کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق مولانا سرفراز خاں صفدر کے پوتوں کو دی جنہوں نے جدوجہد کا حق ادا کرتے ہوئے علماء دیوبند کو اس فتنے کے خلاف متحرک کر دیا۔ فجزاہم اللہ عنا وعن جميع المسلمين خیر الجزاء۔

اگرچہ اس فتنے کا ہر پہلو سے محاکمہ ضروری ہے تاہم، ہمارا ذاتی رجحان اس طرف ہے کہ یہ فکری طور پر شکست خوردہ لوگ ہیں جو مغرب کی اسلام و مسلم دشمن لیکن غالب و بالادست فکر و تہذیب سے مرعوب و متاثر ہیں اور اسلام کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں لہذا ہم اپنی تحریروں میں اسی پہلو کو زیادہ اجاگر کرتے ہیں اور اسلامی ریاست کے خالف غامدی صاحب کے حالیہ بیانے کا رد بھی ہم نے اسی حوالے سے کیا تھا (دیکھیے البرہان، فروری ۲۰۱۵ء)

ہم چونکہ اتحاد امت اور اتحاد بین المسالک والعلماء کے علمبردار ہیں اور اس کے لیے ملی مجلس شرعی کے پلیٹ فارم سے عملی جدوجہد بھی کر رہے ہیں اس لیے فقہی حوالے سے حنفی ہونے کے باوجود ہم حنفیت کے لیے نہ تحریب و تعصب رکھتے ہیں اور نہ دوسرے اسلامی مسالک و مکاتب فکر کا رد مناسب سمجھتے ہیں تاہم غامدی صاحب کے فتنے کا معاملہ دوسرا ہے کیونکہ غامدی صاحب اور ان کے مکتب فکر سے ہمارا اختلاف فروعی نہیں بنیادی امور میں ہے۔ بھلا جو شخص سنت کی حجیت اور اجماع کی اہمیت سے انکار کرے، قرآن کی من مانی تاویلات کرے اور مسلمات شرعیہ اور جمہور امت کے مسلک کو رد کرے اسے اگر فتنہ نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے؟

مجلّے کی انتظامیہ کا یہ جذبہ بھی قابل تعریف ہے کہ انہوں نے ۶۰۰ صفحات کے رسالے کی قیمت محض ۲۰۰ روپے رکھی ہے جو تقریباً لاگت کے برابر ہوگی تاکہ یہ مجلّہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچ سکے۔ دینی مدارس، لائبریریوں، علماء کرام اور یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ کو مجلّہ صفدر کا یہ خصوصی نمبر ضرور خریدنا چاہیے اور اس کی فکر کو عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجلّہ کراچی، لاہور، گوجرانوالہ، ملتان اور سرگودھا کے معروف دینی مکتبوں سے خریداجا سکتا ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے فون نمبر 0320-4902150 اور 0307-5687800 پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

## سکول تعلیم کو مطابق اسلام بنانے کا مسئلہ

### مشکلات اور حل

پاکستان کی ۹۸ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اس ۹۸ فیصد آبادی میں کم از کم ۹۵ فیصد لوگ اپنے دین کے ساتھ والہانہ محبت کرتے ہیں۔ وہ اللہ اور اپنے رسول ﷺ پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن و سنت کا دل و جان سے احترام کرتے ہیں اور اسلامی حمیت سے اتنے سرشار ہیں کہ کسی دینی شعار کی تھوڑی سی اہانت پر بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان سب مظاہر کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ معاشرے میں ملاوٹ اور چور بازاری کا دھندا عام ہے۔ رشوت اور دفتری بد اعمالیوں کی کوئی حد نہیں۔ مال سرکار ہضم کرنا گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ قانون کی پاسداری عنقا ہے۔ بد اخلاقی اور بد چلنی کے مظاہر کی کوئی کمی نہیں، رشتوں کی پاسداری اور انسانی تعلقات کا احترام کم کم نظر آتا ہے۔ مالی بد عنوانیوں سے کوئی طبقہ پاک نظر نہیں آتا۔ اسلام کے حق میں باتیں بہت ہیں لیکن معاشرہ اسلامی نقطہ نگاہ سے دیمک زدہ لکڑی کی طرح اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے درآں حالیکہ:

جدید تعلیمی اداروں اور دینی مدارس کا جال بچھا ہے۔ لاکھوں مساجد میں ہر ساتویں دن جمعہ کے خطبات کی شکل میں وعظ و تلقین کا اہتمام ہوتا ہے۔ سکولوں میں ہر روز صبح کی اسمبلی میں بچے ”لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری“ کی دعائیہ نظم پورے سوز کے ساتھ گاتے ہیں۔ ملک میں شائع ہونے والے لٹریچر میں اکثر کتب دینی موضوعات پر طبع ہو کر مارکیٹ میں آتی ہیں۔ بک فیئرز میں اسلامی موضوعات پر دینی کتب چھائی ہوئی ہوتی ہیں اس لیے کہ لوگ خریدتے ہیں۔

لیکن ہاؤس سکولز اور سٹی سکولز کی سکول چینز (School Chains) کو ایک طرف رکھیے، پرائیویٹ سکولز مالکان کی اکثریت بلکہ بہت بڑی اکثریت اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام تعلیم کے نفاذ اور اس سے قلبی تعلق رکھنے کی دعویدار ہے۔ ذرا چشم تصور میں حراسکولز، الہلال سکولز،

غزالی سکولز، فاران سکولز، قیادت سکولز، دعوت سکولز، دارِ ارقم سکولز، پنجاب سکولز، عثمان سکولز، ریڈ فاؤنڈیشن سکولز، تعمیر ملت سکولز، منہاج القرآن سکولز، اقرار و صفۃ الاطفال سکولز اور اسی طرح کی درجنوں چھوٹی بڑی سکول چینز (Chains) کو ذہن میں لائیے اور ان میں تعلیم حاصل کرنے والے لاکھوں بچوں اور بچیوں پر نظر دوڑائیے۔ بہت بڑی کوشش ہے جو نسل نو کو تعلیم کے زیور سے مزین کرنے کے لیے ہو رہی ہے۔ مذکورہ سکول چینز کے کارپردازان اپنی نیک خواہشات اور دن رات کی محنت کے باوجود وہ نتائج حاصل نہیں کر پا رہے ہیں جن کے وہ متنی ہیں۔ ہماری نظر میں اس کی بنیادی وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱۔ طلباء کو درست کتب کی شکل میں جو مطالعاتی مواد دیا جاتا ہے وہ یا تو اس نظریہ کی نفی کرتا ہے جس کی ترویج کی خاطر سکول قائم کیا گیا ہے اور اگر نفی نہیں بھی کرتا تو اتنا غیر موثر ہے کہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔

۲۔ سکول جس نظریہ کی ترویج اور تنفیذ کے لیے قائم کیا گیا ہے اس نظریہ کے حامل تربیت یافتہ اور سلیقہ مند تدریسی مہارتوں سے لیس اساتذہ میسر نہیں ہیں۔ مزید برآں ایسے اساتذہ کی نظریاتی اور پیشہ ورانہ تیاری کا کوئی قابل اعتماد میکا نزم موجود نہیں ہے۔

۳۔ تعلیمی اداروں کا ماحول اور ہم نصابی سرگرمیاں جو طلبہ کی شخصیت سازی میں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں، اُن کا کوئی قابل عمل ماڈل میسر نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تین اہم عوامل ہیں جو اگر پورے ربط باہمی کے ساتھ موجود ہوں تو توقع کی جاسکتی ہے کہ ہم اسلام اور پاکستان کا انسانِ مطلوب تیار کر سکیں جو اسلامی حمیت کے ساتھ اسلامی فعالیت کا حامل بھی ہو اور جس کے نتیجے میں تدریجاً پاکستانی معاشرہ اسلامی اور قائد اعظم اور علامہ اقبال کے آئیڈیلز کا آئینہ دار بن جائے۔

تحریک اصلاحِ تعلیم اگرچہ پہلے بھی حسبِ مقدور یہ کام کرتی رہی ہے تاہم اب اس نے ایک مربوط منصوبے کے تحت یہ کام کرنے کا پروگرام بنایا ہے جس کی تفصیل اگلے صفحے پر دی جا رہی ہے۔



































































































































































































































































